بھولی ہوئی کہانیاں

از

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

سنہ ۱۹۹۵ء

گابا ایجوکیشنل بُکس

اُردو بازار - ایم اے جناح روڈ - کراچی

بھولی ہوئی کہانیاں

از

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

سنہ ۱۹۹۵ء

گابا ایجوکیشنل بکس

اردو بازار۔ ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بھولی ہوئی کہانیاں دوسروں کی نہیں بلکہ خود میری کہانیاں ہیں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی لیکن افسوس کہ زادِ آخرت پھر بھی کچھ نہیں۔ بقولِ سعدیؒ، اب قارئین میں سے :-

مگر صاحبدلے روزے بہ رحمت

کند در کارِ درویشاں دعائے

اِس مجموعے میں "ہفت محفل" کے دو مضمون (میرا علی گڑھ اور میرا جبل پور) بھی شامل کر لیے گئے ہیں کہ وہ بھی اسی سلسلے سے متعلق ہیں۔

احقر — غلام مصطفیٰ خاں

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

میرا علی گڑھ

دسویں جماعت کا زمانہ

میں جبل پور (سی۔ پی) میں ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں پیدا ہوا۔ گھر میں قرآن پاک، کا ناظرہ مکمل کیا۔ پھر پرائمری اسکول میں داخل ہوا۔ اس کے آخری سال کے امتحان میں بفضلہٖ تعالیٰ پورے شہر کے اسکولوں میں اول قرار دیا گیا اور چار سال تک چار روپے ماہانہ وظیفہ پاتا رہا۔ انجمن اسلامیہ ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان بورڈ سے پاس کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں نویں جماعت کے امتحان میں بھی بہت اچھے نمبر حاصل کیے۔ والد صاحب کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہو چکا تھا لیکن بڑے بھائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بڑا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ وہ پورے گھر کی کفالت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی محدود تنخواہ کے باوجود مجھے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کالج میں نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں چار جماعتیں تھیں۔ طلبہ کا قیام منٹو سرکل اور نیو سرکل کے چار چار ہوسٹلوں میں تھا۔ منٹو سرکل کے چار ہوسٹلوں کے نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ وہ منٹو اے، بی، سی، ڈی کے ناموں سے مشہور تھے۔ (قریب ہی ایک قبرستان تھا اسے منٹو ای کہا کرتے تھے۔) صرف منٹو اے میں دسویں جماعت والوں کی پڑھائی ہوا کرتی تھی اور منٹو بی میں دوسری کلاسیں ہوا کرتی تھیں اور وہ دو منزلہ عمارت تھی۔ اسکے ایک سرے پر محترم پرنسپل عبدالمجید قریشی[1] صاحب کا دفتر تھا۔ ان کے سکریٹری بشیر احمد صاحب تھے اور وائس پرنسپل سید ولی محمد صاحب تھے۔ یہ سب کے سب بڑے باوقار بزرگ تھے اور نہایت ذمہ داری کے ساتھ اپنے کام انجام دیا کرتے تھے۔ ایک کلرک رحمت اللہ تھے۔ ان کو لڑکے بہت ستایا کرتے تھے۔

میں وہاں پہنچا اور اپنے سرٹیفکیٹ وغیرہ پیش کیے تو میرا داخلہ دسویں جماعت میں ہو گیا۔ میرا Enrolment No. 3892 تھا جو پوری تعلیم تک قائم رہا۔ نیو سرکل جسے Irwin Circle بھی کہتے تھے اس کے جوبلی ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۳۵ میں مجھے قیام کی جگہ دی گئی۔ اس کمرے میں پونا کے محمد اسمٰعیل اور بمبئی کے منیرالدین بین دادی میرے ساتھی تھے۔ میرے کمرے کے ساتھ ہی شمس الہدیٰ صاحب، وارڈن کا کمرہ تھا۔ وہ ریاضی پڑھایا کرتے تھے۔ اس ہوسٹل کے دوسرے سرے کے کمرے

---

(۱) عبدالمجید قریشی صاحب پاکستان بننے پر کراچی میں قیام پذیر رہے۔ سید ولی محمد صاحب کئی سال اردو کالج کراچی میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ لاہور میں انتقال فرمایا۔

میں شیخ علی جواد صاحب رہتے تھے۔ وہ دینیات پڑھاتے تھے۔ دسویں جماعت کی کلاسیں جو منٹو اے میں ہوا کرتی تھیں اس کے سات سیکشن تھے۔ میں ایف سیکشن میں تھا اور سعید الزماں صاحب ہم لوگوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ بہت نفیس طبیعت والے تھے۔ واجد علی شیدا صاحب فارسی پڑھاتے تھے۔ (ان کے صاحبزادے ممتاز علی صاحب کراچی میں ہیں۔) ان کے عزیز صبیح الدین حیدر صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے، ان کو سب لڑکے چچا صبیح الدین کہا کرتے تھے۔ چہرہ رعب دار تھا اور اگر کبھی اتفاق سے وہ مسکرا دیتے تھے تو لڑکے کہتے تھے کہ آج بارش ہو جائے گی۔ جی سیکشن میں معین الحق صاحب انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ بعد میں یونیورسٹی کی جماعتوں میں تاریخ پڑھانے لگے تھے اور پی ایچ ڈی بھی ہو گئے تھے۔ جی سیکشن کا ایک شریر طالب علم ناصر تھا۔ وہ بیچارہ کراچی میں معذور سا ہو گیا ہے، وکالت کرنے لگا تھا۔ (مارچ ۱۹۹۴ء میں فوت ہوا)

چند ماہ کے قیام کے بعد مجھے یرقان ہو گیا تھا۔ یونی ورسٹی ہسپتال کے ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ صاحب نے ہوسٹل کا دورہ کیا تو مجھے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہاں رائے پور (سی۔ پی) کے حبیب اللہ صاحب بھی داخل تھے۔ یرقان کی وجہ سے مجھے سولی کا ساگ اور روٹی دونوں وقت کھلائی گئی۔ دو تین دن تو میں نے برداشت کی، پھر قریب ہی مُلّا مٹھائی والے کے یہاں جا کر سیر ہو کر مٹھائی کھائی۔ وہ بہت اچھی مٹھائی بناتا تھا تو اچھی مٹھائی کیوں نہ کھائی جائے؟ بہرحال اس مٹھائی نے مجھ پر بہت اچھا اثر کیا اور میں دوسرے دن واپس اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

میں اپنے وطن سے نویں جماعت پاس کر کے علی گڑھ گیا تھا لیکن وہاں نویں اور دسویں دونوں جماعتوں کا نصاب ایک ہی سال میں پورا کرنا تھا۔ ان دونوں جماعتوں کے نصاب میں انگریزی کے لیے گیارہ کتابیں تھیں۔ (نثر، نظم، سرسری مطالعہ کے لیے)۔ حساب میں چکرورتی کی مشہور کتاب تھی۔ ایلجبرا K. B. Basu والا تھا۔ جیومیٹری کے لیے Hall & Stevens کے پانچ حصے، تاریخ کے لیے برطانیہ اور ہندوستان سے متعلق کتابیں، جغرافیہ پوری دنیا کا، اردو، دینیات اور ایک اختیاری مضمون، اور سوائے اردو اور دینیات کے ہر مضمون کے لیے جواب انگریزی میں دینا تھا۔ (آج کل کے لڑکے تو اس قدر نصاب کے متحمل نہیں ہو سکتے)۔ نیو سرکل کے جوبلی ہوسٹل کے ہال میں ظہر کے بعد نصاب کی تیاری کے لیے طلبہ کو جمع ہونا پڑتا تھا اور عصر تک وہاں بیٹھنا ضروری تھا۔ بعض اساتذہ مدد کے لیے موجود رہتے تھے۔ اس ہوسٹل سے ملا ہوا نصر اللہ ہوسٹل تھا۔ اس کے ہال میں ڈائننگ کا انتظام تھا۔ اس ہوسٹل میں زیادہ تر بی۔ ٹی والے طلبہ رہتے تھے جن کو یار لوگ بینی والے کہا کرتے تھے۔

کچھ بھوپال کے طلبہ بھی وہاں رہتے تھے کیونکہ وہاں کے نواب نصر اللہ خاں مرحوم نے وہ ہوسٹل تعمیر کرایا تھا۔ تیسرا ہوسٹل نواب مزمل اللہ خان مرحوم (رئیس بھیکم پور) نے بنوایا تھا۔ اس کا نام مزمل ہوسٹل تھا۔ اس کے ہال میں پانچوں نمازیں ہوا کرتی تھیں۔ چوتھا ہوسٹل میرس Marris Hostel تھا۔ جس کے ہال میں انٹرمیڈیٹ کالج کی تمام تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ کل ہند مشاعرہ بھی وہاں منعقد ہوتا تھا۔

علی گڑھ کی روایات میں سے ایک روایت یہ تھی کہ پرانے طلبہ اپنے نئے بھائیوں سے ملنے کے لیے ایک رات Introduction Party منعقد کرتے تھے۔ تمام ہوسٹلوں کا دورہ کرتے تھے اور نئے طلبہ سے "سرسید کی فاتحہ" کے لیے چندہ وصول کرتے تھے۔ پھر ایک رات سب پرانے اور نئے طلبہ جمع ہو کر "سرسید پر فاتحہ پڑھے بغیر" مٹھائیاں کھاتے تھے۔ یہ رات بہت دلچسپ ہوا کرتی تھی اور نئے طلبہ کی خامیوں کا اس طرح مذاق اڑایا جاتا تھا کہ وہ ان خامیوں کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔
پانچوں نمازوں میں شرکت بھی ضروری تھی اور حاضری بھی لی جاتی تھی۔
شہر جانے کے لیے اِکّے کی سواری تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کے کسی گوشے سے شہر جانے کا
کرایہ صرف تین آنے تھا۔ اکّے میں تین لڑکے بیٹھ جاتے تھے اور ایک ایک آنہ ہی دینا پڑتا تھا۔
بہت سستا زمانہ تھا۔ ۱۰ آنے میں ایک سیر چھلے ہوئے اخروٹ اور چار آنے سے لے کر
چھے آنے تک میں ایک سیر کشمش مل جاتی تھی۔ دس آنے سیر گھی مل جاتا تھا اور چار آنے کی سوا سیر شکر تھی۔ دودھ دو آنے سیر تھا۔ بلکہ دودھ پور میں جو یونیورسٹی کے مشرق میں ایک گاؤں تھا (اب وہ خوبصورت بنگلوں کا محلہ ہے) دودھ چھے پیسے سیر بھی مل جاتا تھا۔ مٹی بہت زرخیز تھی کہ ایک سال میں کئی کئی فصلیں تیار ہو جاتی تھیں۔ ارہر کے پودے ۸۔ ۹ فٹ تک کے ہو جاتے تھے۔ شہر کے مشہور درزی علاء الدین، تکسی اور پرشادی تھے۔ پھر عبدالغفار اور اس کا بھائی عبدالستار تھا جو یہاں حیدر آباد آ کر فوت ہوا۔ ابراہیم بھی بہت اچھا درزی تھا۔ یہ لوگ ٹھنڈی شیروانی کی سلائی کے دو روپے لیتے تھے۔ گرم شیروانی کے تین روپے اور چیسٹر کے (مع استر) صرف پانچ روپے لیتے تھے۔ ۶ آنے گز عمدہ لٹھا D-One مل جاتا تھا بلکہ ایک سستا کپڑا دو آنے گز بھی تھا۔ ہوسٹل میں رہنے، کھانے اور پڑھائی وغیرہ کی کل فیس ۲۵ روپے ۱۰ آنے تھی۔ دھوبی ایک آنہ فی کپڑا لیتا تھا۔ حجام چار آنے لیتا تھا۔ باغوں کی طرف ہم لوگ چلے جاتے تھے تو امرود اور بیر کی قیمت وہاں کے لوگ نہیں لیتے تھے۔ بڑا عمدہ گنا ایک، آنے میں مل جاتا تھا۔ مٹر کی پھلیاں توڑنا "جائز" مشغلہ تھا۔
ہوسٹل میں بسکٹ اور حلوا وغیرہ فروخت کرنے والے وینڈر آتے تھے۔ ایک صوفی صاحب عمدہ

بسکٹ بلکہ گھر کی بعض مٹھائیاں وغیرہ بھی ہم لوگوں کے لیے لاتے تھے۔ سرسید کے زمانے کا پان بیچنے والا کھمانی (ہندو) بھی آتا تھا۔ بہت کمزور تھا لیکن پان Betel کی آوازیں لگاتا تھا۔ اسی زمانے کا ممتاز فیرنی والا بھی تھا۔ بہت بوڑھا تھا۔ دُبلا پتلا، شیروانی اور سفید پگڑی کے ساتھ بہت تیزی سے چلتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا ہوتا تھا جس کے سر پر ایک تھالی میں تین قسم کی فیرنی کی پیالیاں ہوتی تھیں۔ ایک کا نام انٹرمیڈیٹ، دوسری کا بی۔ اے اور تیسری قسم کا نام ایم۔ اے تھا۔ ان کی قیمتیں علی الترتیب دو آنے چار آنے اور چھ آنے ہوا کرتی تھیں۔ بریلی کے بانس والی مضبوط چارپائی صرف دو روپے میں مل جاتی تھی۔ پھل اور مٹھائی بہت سستی تھی۔ علی گڑھ کی گزک۔ صابونی بھی بہت سستی تھی۔ تالے بہت مشہور تھے اور دور دور فروخت ہوتے تھے۔ سڑکوں پر مصنوعی پتھر سنگ گِل (سِجّیل) بچھایا جاتا تھا جو ایک قسم کی مشین سے تیار کیا جاتا تھا۔

طلبہ میں ہنسی مذاق، فطری چیز ہے لیکن ایک دوسرے کی مٹھائی غائب کرنا ضروری مشغلہ تھا۔ کہتے تھے کہ چوری کی مٹھائی کھانے سے زیادہ خون بنتا ہے۔ لیکن آپس میں ہمدردی بہت تھی۔ کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے احباب بڑی خدمت کرتے تھے۔ سر کی مالش کرنا، دوا لانا، پھل وغیرہ مہیا کرنا ان کی شرافت کا تقاضا تھا۔ ہنسی مذاق میں کبھی بیہودگی نہیں تھی۔ البتہ بعض طلبہ کی اصلاح کے لیے رات کو ان پر پانی یا رنگ پھینکنا بھی ایک مشغلہ تھا جسے Activity کہتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ بارش کے زمانے میں Mud Riot ہوتا تھا یعنی طلبہ ایک دوسرے پر مٹّی اچھالتے تھے۔

فروری میں تھانہ بنّا دیوی کے پاس سالانہ نمائش کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ دور دور سے مختلف اشیاء کی دکانیں آتی تھیں لیکن طلبہ کی دلچسپی پشاور کے کباب پراٹھے کی دکان تھی جہاں عموماً بھی لڑکے شام کے وقت ایک دوسرے کی ضیافت کیا کرتے تھے۔

سالانہ مشاعرے اور مباحثے Debates وغیرہ بھی بہت دلچسپ مشغلے تھے۔ یونین کے انتخابات Elections میں امیدواروں کے لیے کارکن حضرات بہت وقت صرف کرتے تھے۔ تمام ہوسٹلوں میں جا جا کر ان کی حمایت میں تقریر کرتے تھے۔ پھر جو امیدوار ہار جاتا تھا اس کے حامیوں کا ماتم کیا جاتا تھا اور ان کا مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ پھر بھی احتیاط کی جاتی تھی کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

طلبہ میں پڑھنے کا شوق تھا۔ رات کو دیر تک پڑھا کرتے تھے۔ لیکن قریب دس بجے رات تک گپیں لگاتے تھے۔ پھر چائے پی کر نیند بھگائی جاتی تھی۔ لیکن مجھ جیسے بہت کم اُلّو تھے جو عشاء کے فوراً بعد سو جاتے تھے اور تین بجے رات سے اٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ بعض ایسے رئیس طلبہ بھی تھے جو علی گڑھ میں دیر تک قیام کرنے کو اپنا مقصد حیات جانتے تھے اور پاس ہونا نہیں چاہتے تھے۔

میں دسویں جماعت میں تھا تو مجھے سہ ماہی امتحان میں بہت اچھے نمبر ملے اور جغرافیہ کے پرچے میں سب سے زیادہ نمبر ملے۔ چچا صبیح الدین حیدر صاحب میری کاپی کلاس میں لائے اور پوچھنے لگے کہ ?Who's answer book is this میں ڈر گیا کہ شاید کوئی غلطی یا گستاخی مجھ سے سرزد ہوئی ہے اس لیے پوچھ رہے ہیں۔ میں خاموش رہا۔ انہوں نے دوبارہ سوال کیا۔ میں پھر خاموش رہا۔ لیکن جب انہوں نے تیسری بار وہی سوال کیا تو میں ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ .It is mine۔ چچا صبیح الدین صاحب بہت خوش ہوئے اور بہت تعریف فرمائی۔ بات دراصل یہ تھی کہ جبل پور کے اسکول میں سخت محنت کرائی جاتی تھی۔ کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں کمزوری ہو۔ آٹھویں جماعت تک وہاں کے طلبہ انگریزی گرامر میں بہت پختگی پیدا کر لیتے تھے۔ یعنی Parsing اور Analysis بہت آسانی سے کر لیتے تھے اور شہر کے دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں بہت ممتاز تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں بھی بہت محنت کرائی جاتی تھی۔ نویں جماعت کے استاد رفیع الدین صاحب مرحوم نے اس قدر محنت کرائی تھی کہ مجھے علی گڑھ کی بارہویں کے جغرافیہ تک میں سہولت پیدا ہو گئی تھی۔ گیہوں، چاول، کپاس وغیرہ کی کاشت کے لیے مٹی کیسی ہو؟ درجہ حرارت کیا ہو؟ بارش کتنے انچ تک مفید ہو سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر نقشے بنانے کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔ میں نے سہ ماہی امتحان کی کاپی میں یہ سب باتیں لکھی تھیں اور Ferrel's Law بھی لکھ دیا تھا یعنی:

Winds blowing in the northern hemisphere are deflected to their left and winds blowing in the southern hemisphere are deflected to their right.

چچا ایسے جوابات سے بہت خوش ہوئے اور پھر میرا بہت خیال کرنے لگے۔

علی گڑھ میں دسویں جماعت، پھر انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک دینیات بھی ایک لازمی مضمون تھا۔ یعنی اگر کوئی طالب علم اس مضمون میں فیل ہو جاتا تھا تو آئندہ سال نہ صرف اس مضمون میں بلکہ تمام مضامین میں اسے دوبارہ شرکت کرنا لازمی تھا۔ اس زمانے میں کسی طرح کی رعایت نہیں تھی اور کبھی کوئی Supplementary Examination نہیں ہوتا تھا بلکہ پاکستان بننے کے چند سالوں تک بھی یہی قاعدہ تھا۔ دینیات کے استاد شیخ علی جواد صاحب تھے جو اس وقت تو ڈاڑھی منڈواتے تھے (بعد میں ڈاڑھی رکھ لی تھی) لیکن اپنے معاملات میں بہت متقی اور خدا ترس تھے۔ طلبہ نے بہت سے فرضی قصے ان کی ذاتی زندگی سے متعلق بنا لیے تھے۔ شیخ صاحب فقہی مسائل بہت خوبی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ ان کی دو باتیں اب تک خوب یاد ہیں کہ پوری بخاری شریف میں رفع سبابہ کا کہیں ذکر

نہیں ہے اور یہ کہ احناف کے نزدیک جمعہ کا خطبہ غیر عربی زبان میں جائز ہے۔ شیخ صاحب عید بقر عید میں معانقہ نہیں کرتے تھے لیکن ہم لوگ ان سے زبردستی معانقہ کر لیتے تھے۔ وہ اور دوسرے اساتذہ بہت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور ان سے دن رات میں کسی وقت بھی استفادہ کیا جاسکتا تھا۔

دسویں جماعت کے زمانے میں دہلی کی سیر کا ارادہ ہوا۔ میرے ہم جماعت محی الدین جمالی (پڈرونا۔ گورکھپور) نے رہبری کی۔ اس زمانے میں علی گڑھ سے دہلی کا (واپسی کا) ٹکٹ ایک روپیہ پانچ آنے میں ملتا تھا۔ جمعہ کو جاکر منگل تک واپس آسکتے تھے۔ ہم دونوں غالباً ہفتے کے دن دہلی کو روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر جامع مسجد، لال قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے تک تمام مقامات اور مزارات پیدل ہی دیکھے۔ پھر حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ کے یہاں حاضر ہوا۔ فاتحہ خوانی کے بعد بیٹھ گیا تو آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ انعامات عطا ہوئے جو تحریر میں نہیں آسکتے۔ میرے وہ دوست کئی مقامات پر حاضری کے بعد آئے تو مجھے زور زور سے ہلا کر اٹھانے لگے میں نے ان سے کہا کہ آپ جائیں میں ذرا دیر اور بیٹھوں گا۔ چنانچہ دوبارہ وہی انعامات عطا ہوئے جو پہلے ہوئے تھے۔ زبان میں طاقت نہیں کہ شکر ادا کر سکوں۔ الحمدللہ الحمدللہ۔

اپریل ۱۹۲۹ء میں دسویں جماعت کا امتحان اسٹریچی ہال میں ہوا اور ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد نتیجہ آیا۔ بحمداللہ بہت اچھے نمبروں سے مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ امتحان کے بعد موسم گرما کی تعطیل میں وطن واپس ہوا تو دو لطیفے پیش آئے۔ وطن میں اور دوسرے مقامات میں بھی عموماً یہ خیال تھا کہ جو لڑکے انگریزی پڑھتے ہیں وہ عیسائی ہوجاتے ہیں اور بہت نازک بن جاتے ہیں۔ وطن میں ایک بوڑھے آدمی ملے۔ ازراہ دین داری فرمانے لگے کہ" اپنے بزرگوں نے جو کچھ قرآن میں لکھ دیا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا"۔ (یعنی تم قرآن کو مت چھوڑنا جو اپنے بزرگوں نے لکھا ہے)۔ میں سوائے خاموش ہوجانے کے ان سے اور کیا کہتا! ع پسر گشتی درہ ترا فستی

ایک اور لطیفہ بعد میں یہ ہوا کہ ایک حاجی صاحب جو میرے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ حج کر چکے تھے وہ کسی دوسرے شہر سے ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ اس شہر میں کوئی مقام تفریح کے لیے ہو تو مجھے لے چلو، لیکن دیکھو، پیدل چلنا پڑے گا۔ (ان کا خیال تھا کہ انگریزی پڑھنے کی وجہ سے میں نازک ہو گیا ہوں)۔ میں نے عرض کیا، کہ ضرور چلیے اور پیدل ہی چلیے۔ میرے مکان سے مدن محل قریب ۷ میل کے فاصلہ پر تھا۔ میرا ایک دوست ظہور بڑا مسخرہ تھا۔ اس سے میں نے کہا کہ حاجی صاحب کو مدن محل کی سیر کرانا ہے۔ دن مقرر ہوا۔ ظہور نے حاجی صاحب سے کہا کہ لائن میں کھڑے ہوجائیے۔ میں کہوں گا، ایک، دو، تین۔ جب تین کہوں تو آپ

چل پڑیے گا۔ چنانچہ تین کہتے ہی حاجی صاحب اور ہم دونوں روانہ ہوگئے۔ ظہور نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں بہت تیزی سے چلیں اور قریب ایک فرلانگ چل کر بیٹھ جائیں حاجی صاحب جب ہمارے قریب پہنچیں گے تو ہم لوگ پھر تیزی سے چل کر آگے بیٹھ جائیں گے۔ بہرحال وہ ۷ میل کا فاصلہ اسی طرح طے ہوا۔ پھر جب پہاڑی علاقہ شروع ہوا تو حاجی صاحب بسم اللہ، بسم اللہ کہتے ہوئے قدم بڑھانے لگے۔ ظہور نے ۷۸۶ - ۷۸۶ کہنا شروع کیا۔ حاجی صاحب مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا بکتا ہے؟ ظہور بول پڑا کہ حاجی صاحب میرا وضو نہیں ہے اس لیے میں بسم اللہ کے بجائے ۷۸۶ کہہ رہا ہوں۔ حاجی صاحب چپ ہو گئے۔ لیکن ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حاجی صاحب نے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے؟ وہاں مسجد کے سامنے درخت لگے ہوئے تھے۔ ظہور کہنے لگا یہ کیا جھاڑ فانوس لگے ہوئے ہیں۔ یہیں تو مسجد ہے۔ غرض کہ اس طویل پیدل سفر سے حاجی صاحب کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ انگریزی پڑھنے والے نازک ہوتے ہیں۔ حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ فلاں شخص کی لڑکی کی شادی ہوئی تو میں نے بہت سے تحفے دیے۔ لیکن جب میری لڑکی کی شادی ہوئی تو اس نے کچھ نہیں دیا۔ میں نے کہا" حاجی صاحب مجھے اس شخص کا پتا بتائیے میں اسے خط لکھوں گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور اس نے ہمارے حاجی صاحب کو کیا سمجھا ہے؟" حاجی صاحب کہنے لگے نہیں نہیں، ایسا مت کرنا۔ لیکن میں دریافت کرتا ہی رہا اور وہ نہیں نہیں کہتے رہے۔ بہرحال، حاجی صاحب جتنے دن رہے ہم لوگوں کی تفریح کا سامان بنے رہے۔

یہاں تک تو دسویں جماعت کے زمانے سے متعلق حالات تھے۔ اب گیارہویں بارہویں کے زمانے کے حالات عرض ہیں۔

انٹرمیڈیٹ کا زمانہ

میں نے گیارہویں جماعت میں داخلہ لیا تو مزمل ہوسٹل کو انتخاب کیا۔ اس کے کمرہ نمبر ۳۲ میں میرا قیام تھا تو جبل پور کے مشہور کھلاڑی اور میرے پرانے دوست عبدالحئی بھی اسی کمرے میں آگئے۔ پھر ان کے عزیز سراج الحق بھی ساتھ ہو گئے۔ عبدالحئی نے ہاکی، دوڑ اور لانگ جمپ میں بڑا نام پیدا کیا۔ سراج الحق کے دوست علی جواد (جو کراچی میں جج ہو گئے تھے) اور اس وقت جوبلی ہوسٹل میں تھے اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت شہرت رکھتے تھے۔ ان کے ایک دوست بدیع الدین تھے جو سیلون سے آئے ہوئے تھے (اور بعد میں وہاں وزیر تعلیم ہوئے)۔ وہ انگریزی کی قابلیت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ایک قلمی انگریزی اخبار بھی وقتاً فوقتاً شائع کیا کرتے تھے۔ بہار کے اختر امام بھی جوبلی ہوسٹل سے مزمل ہوسٹل آگئے تھے۔ وہ عربی اور اردو شعر و شاعری میں نمایاں صلاحیت کے مالک تھے۔ نسخ خط

بہت خوبصورت لکھتے تھے۔ میں شرارت سے کوئی مہمل شعر بنا کر ان سے کہتا کہ بھائی اس شعر کا مطلب سمجھا دو وہ بہت غور کرتے اور کچھ نہ کچھ مطلب نکال لیتے۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے میں وہ الیکشن کے چکر میں پھنس گئے اور لائبریرین کی جگہ کے لیے منتخب ہو گئے لیکن خواہ مخواہ ایک سال ضائع کر دیا۔ ہم سب کو ان کے اس نقصان کا بڑا افسوس ہوا۔ قریب ہی کے کمرے میں بہار کے شفیق الحسن تھے۔ بہت خلوص والے تھا۔ (غالباً ۱۹۵۷ء میں ان کو پٹنہ کے پتے پر میں نے خط لکھا تھا۔ خط پہنچنے سے ایک دو دن پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے عزیز پروفیسر عبدالمجید صاحب نے جواب دیا تھا)۔

اسی ہوسٹل میں بہار کے معین بھی تھے۔ جنہیں بریگیڈیئر بننے کا بہت شوق تھا۔ طلبہ ان کو مذاق میں بریگیڈیئر ہی کہا کرتے تھے۔ بہار کے ایک دوست شمس الہدیٰ بھی تھے۔ وہ کراچی آ گئے تھے۔ اللہ، اللہ کتنے احباب تھے جن کا اب کوئی پتا نہیں۔ البتہ اختر امام ابھی چند سال پہلے تک سیلون میں عربی کے پروفیسر تھے اور انہوں نے باہر سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی تھی (نومبر ۱۹۹۳ء میں کراچی میں فوت ہوئے) میں اس ہوسٹل میں دو سال تک نماز کا مانیٹر تھا۔ تو سندھ کے ایک طالب علم کے خالص سندھی نام گھنگھر ویشن خان دھیگو کے نام پر چونکہ پڑتا تھا۔ سندھ کے عرفان کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے اور غلام حسن (جو سندھ میں سیشن جج وغیرہ کے عہدوں پر فائز ہوئے)۔ میرے خاص دوستوں میں تھے۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی صاحبزادی خالدہ سندھ یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ اسی زمانے میں مراد آباد کے سید محمد صاحب، علی گڑھ شہر کے انتظام الدین صاحب اور اُجین کے عبدالغنی صاحب بڑے مخلص دوست رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اچھا رکھے آمین۔

عبدالحئی جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے (وہ جبل پور میں ۱۹۹۱ء میں فوت ہو گئے) ایک سال کے قیام کے بعد وطن چلے گئے اور ان کے عزیز سراج الحق جب دوسرے کمرے میں چلے گئے تو میرے کمرے میں حبیب اللہ (دہلی والے) آ گئے۔ وہ پڑھنے سے کم تعلق رکھتے تھے۔ باتیں بہت کرتے تھے اور بار بار پبلک کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس لیے ان کا نام ہی پبلک مشہور ہو گیا تھا۔ غالباً ۱۹۷۴ء میں حج کے موقع پر جدہ میں ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہیں وہ دل کے عارضے میں فوت ہوئے۔

انٹرمیڈیٹ میں ضروری مضامین کے علاوہ میرے اختیاری مضامین فارسی، تاریخ اور جغرافیہ تھے۔ فارسی جناب محمد حاذق صاحب اور محترم ضیاء احمد بدایونی صاحب پڑھاتے تھے۔ تاریخ جناب ابرار حسین قادری صاحب اور عبدالعزیز پوری صاحب پڑھاتے تھے اور جغرافیہ محمد حنیف صاحب پڑھاتے تھے۔ تاریخ کی نصابی کتابوں کے علاوہ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کی تاریخ اُمیّہ و عباسیہ، پروفیسر نوازش علی صاحب کی تاریخ تُرکیہ، مکرجی کی تاریخ ہند اور سوہن لال کا جغرافیہ مجھے زیادہ پسند

تھا۔ دینیات جناب شیخ علی جو صاحب اور "مولوی منکا" پڑھاتے تھے۔ جن کی توند کی وجہ سے ان کا یہ نام زیادہ مشہور تھا۔ وہ اس قدر زور سے پڑھاتے تھے کہ کئی کمروں کی پڑھائی ختم ہو جاتی تھی۔ ابھی ۴۔۵ سال ہوئے ان کے صاحبزادے مجھ سے ملنے آئے تو انہوں نے اپنی شناخت اسی مشہور نام سے کرائی۔ انگریزی ایک چھوٹے قد والے استاد پڑھاتے تھے جن کے نام کا انگریزی ترجمہ یعنی Courage Ali زیادہ مشہور تھا۔ لیکن سید ولی محمد صاحب (وائس پرنسپل) اور اشفاق صاحب (نواب وقار الملک کے صاحبزادے) بہت شفقت اور محبت سے انگریزی پڑھاتے تھے عبدالشکور صاحب بھی انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ بعد میں افریقہ چلے گئے۔ (میری عادت تھی کہ استادوں کی تقریر کا ہر لفظ لکھ لیتا تھا۔ اسلیے مجھے امتحان کے وقت بڑی آسانی ہو جاتی تھی اور بہت سے طلبہ اسی لیے مجھے گھیرے رہتے تھے)۔ اردو جناب خاوری صاحب اور مولانا احسن مارہروی (م ۱۳۵۹ھ) پڑھاتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ اپنی قابلیت، نفاست پسندی اور بذلہ سنجی میں بے مثل تھے اور مولانا احسن ہی کا فیض تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج میں کُل ہند مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں پورے ملک کے مشہور شعراء شرکت کرتے تھے بلکہ بعض کو اسی شرکت کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ مولانا نے رام پور کا ایک تمثیلی مشاعرہ بھی منعقد کیا تھا اور ان شعراء کے ایسے حالات لکھے تھے جو وہی لکھ سکتے تھے۔ مولانا نے طلبہ میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لیے طرحی مشاعرے بھی شروع کیے تھے۔ وہ کوئی مصرع دیدیتے تھے جس کے مطابق طلبہ غزلیں تیار کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا نے ایک مصرع یہ دیا تھا:۔ ع افسانہ وہ سناؤں جو تم نے سنا نہ ہو

ایک شریر طالب علم نے ایک غزل ایسی لکھی کہ ایک شعر میں مجنوں کو لیلیٰ کا شیر خوار بنا دیا۔ شعر یہ تھا

مجنوں کو لے کے ... لیلیٰ نے یوں کہا ۔ لے پی لے ... جو تو نے پیا نہ ہو

مولانا اس شعر پر "خاموش خاموش" ہی کہہ سکتے تھے۔ لیکن پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

ایسے مشاعروں کی وجہ سے شعر گوئی کا ذوق عام ہو گیا تھا۔ نیو سرکل کے دواخانے میں ایک کمپاؤنڈر تھے۔ ان کا قد چھوٹا تھا۔ لڑکے ان کو ڈاکٹر ٹونی Tiny کہا کرتے تھے۔ وہ بھی شاعری فرمانے لگے تھے۔ میرے کمرے میں کبھی کبھی آ کر اپنے بے تکے اشعار سنانے لگتے تھے۔ لڑکے انہیں گھیر لیتے تھے۔ بڑی تفریح رہتی تھی۔ میں ان سے کہتا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے اشعار میں کیا خوب سکتہ ہے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ سکتہ کوئی شعری خوبی ہوتی ہے۔

مزمل ہوسٹل کے جنوب میں کسی گاؤں کے کھنڈر تھے۔ پانی بھرا رہتا تھا۔ بگلے وغیرہ پرند

وہاں آبیٹھتے تھے۔ ہمارے دوست سردار خان (گدڑی اسٹریٹ۔ بہرائچ والے) اکثر پرندوں کا شکار کرکے ہم لوگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اس جگہ بعد میں بنگلے بن گئے تھے۔ ہمارے استاد ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا بنگلہ بھی وہیں بن گیا تھا۔

اس ہوسٹل سے مغرب کی جانب (قریب ایک میل پر) دولت راؤ سندھیا کا قلعہ تھا۔ جو ۱۸۰۴ء میں General Lake نے فتح کیا تھا۔ ہمارے زمانے میں اُجاڑ تھا۔ بڑی بڑی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ببول کے درختوں میں فاختہ کے گھونسلے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں مورنی کے دو انڈے ملے تھے۔ سیاہ سانپ اور دو منہ والے سانپ بھی وہاں تھے۔ خارپشت جانور کے بل بھی تھے۔ اس سے کچھ آگے ایک جگہ پانی بھرا ہوا تھا جہاں سنگاڑے کی کاشت تھی۔ احباب کا مشورہ ہوا کہ وہاں چلو۔ سنگاڑے کھائیں گے۔ سنگاڑے کھا کر واپس ہوئے تو ایک بڑا سیاہ سانپ اپنے بل سے باہر نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ سب لڑکے بھاگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی۔ میں اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ بھی تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر واپس چلا گیا۔

انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں بھائی انتظام الدین سے تعلقات بڑھے تو میں ان کے گھر بھی جانے لگا جو ریلوے اسٹیشن کے مغرب میں محلہ شاہ کمال میں ہے۔ اسی کے قریب نواب دھرم پور والوں کی کوٹھی ہے۔ کوٹھی کے بالکل سامنے ان کی بنائی ہوئی مسجد ہے جس کے صحن کے دروازے میں داخل ہوتے ہی دونوں طرف دو خالی قبریں ہیں۔ مجھے بچپن میں والدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ ہم لوگ جب کھنڈوا (سی۔ پی) میں تھے تو بمبئی سے آنے والی گاڑی کے فرسٹ کلاس ڈبے میں ایک نواب صاحب علی گڑھ کی طرف جا رہے تھے۔ جب ۱۲ بجے رات کو وہاں گاڑی پہنچی تو اتفاق سے اس ڈبے کا دروازہ کھل گیا۔ پولیس نے دیکھا کہ وہاں کوئی شخص گیروا کپڑے پہنے ہوئے مردہ پڑا ہوا ہے۔ پولیس نے یہ سمجھ لیا کہ کوئی فقیر ہے جو اس ڈبے میں گھس گیا ہوگا. لاش کو باہر نکال لیا اور قبرستان میں دفن کر دیا۔ لیکن کپڑوں میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے تو خیال ہوا کہ یہ فقیر نہ ہوں گے۔ نواب صاحب کے ملازم دوسرے ڈبے میں تھے۔ جب گاڑی صبح کے وقت کسی آگے کے اسٹیشن پر پہنچی تو وہ لوگ نواب صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ان کے ڈبے میں آئے لیکن اسے خالی پایا۔ اس زمانے میں ٹیلیفون کا انتظام نہیں تھا۔ ان لوگوں نے مختلف اسٹیشنوں پر تار بھیجے۔ بمشکل کھنڈوا سے یہ واقعہ معلوم ہوا۔ جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو دفن کو بہت وقت گزر چکا تھا۔ کوئی اور چارہ سمجھ میں نہیں آیا اور صبر ہی کرنا پڑا۔ راقم الحروف ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ میں تھا۔ اس وقت تک نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کی قبر بھی خالی پڑی ہوئی تھی۔ انا للہ ۔ ۔ ۔

علی گڑھ میں ۱۹۳۰ء میں بجلی شروع ہوئی۔ لیکن پنکھے وغیرہ نہیں بنے تھے۔ ہم لوگ اس سے پہلے لالٹین استعمال کرتے تھے اور منٹو سرکل نیز نیو سرکل کے بیچوں بیچ باغ کے اندر فانوس لگے ہوئے تھے۔

اس زمانے میں مٹھائی کی چوری کا ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ ایک طالب علم نے داخلہ لیا اور کمرے میں وہ اپنا سامان سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی مٹھائی کی ٹوکری غائب ہوگئی۔ وہ دوڑتا ہوا وارڈن صاحب کے پاس شکایت کرنے گیا۔ انہوں نے فرمایا: "لڑکے کتنے نالائق ہیں کہ خود ہی سب مٹھائی کھا گئے اور مجھے بھی شریک نہیں کیا"۔ وہ بیچارہ یہ جواب سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ علی گڑھ کی زندگی میں مٹھائی کا غائب ہونا ایک ضروری تفریح ہے۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان میرس ہوسٹل کے ہال میں منعقد ہوا۔ ۹ بجے امتحان شروع ہوا اور صرف ۵ منٹ کے بعد ایک سانحہ پیش آیا۔ میں آرٹس میں تھا اور مغربی پاکستان کے گورنر اختر حسین کا چھوٹا بھائی عاشق حسین سائنس میں تھا۔ بہت ذہین اور محنتی تھا۔ وہ غالباً دوات یا قلم اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ Head Invigilator صاحب نے گرج کر فرمایا: What's there! ۔ بس تین سال کے لیے اس بیچارے کو تعلیم سے خارج کر دیا۔ ہر شخص کو افسوس ہوا لیکن ڈسپلن ایسا تھا کہ کوئی احتجاج نہ ہوسکا۔ یہ Head Invigilator اسی طرح کے کارنامے انجام دینے میں شہرت رکھتے تھے۔ وہ اسٹیج پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے چہرے کے سامنے اخبار کھول لیتے تھے اور اس میں تھوڑا سا سوراخ کر کے اس میں سے پورے ہال کو دیکھتے رہتے تھے۔ گویا وہ طلبہ کو موقع دیتے تھے کہ وہ کچھ کریں اور میں ان کو نکالوں۔ متعدد طلبہ کی زندگیاں انہوں نے تباہ کی تھیں۔ آخر ان کا اور ان کی اولاد کا جو انجام ہوا وہ یونی ورسٹی والوں سے پوشیدہ نہیں۔

بی اے کا زمانہ :-

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اور یونی ورسٹی کی بی اے کلاس میں داخلہ لیا۔ سید محمد صاحب میرے کرمفرما تھے۔ ان کے ساتھ S.S. West ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۸ میں میرا قیام تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے اور اکثر باہر میچ کھیلنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ دوڑ لگانے میں بھی ان جیسے لوگ شاذ و نادر ہوں گے۔ ایک مرتبہ ان کے ساتھ میں نے بھی علیگڑھ سے منظور گڑھی اسٹیشن تک (۹۔ ۱۰ میل) دوڑ لگائی تھی۔ فارسی اور انگریزی کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں استاد مختار حامد علی صاحب کی وجہ سے Thomas Hardy کے ناولوں اور افسانوں سے طلبہ کو زیادہ دلچسپی تھی۔

سید محمد صاحب (۱) بر ہنتے ہارڈی کی ایک کتاب پڑھ کر اس کا خلاصہ مجھے سناتے تھے۔ میں بھی اسی طرح ان کو سناتا تھا۔ William Lequexe, A.G.Gardiner, G.K.Chesterton, Stevenson, F.W.Bain وغیرہ بکثرت مصنفین کی کتابیں ہم دونوں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ اسی لیے ہم لوگوں کی انگریزی آج کل کے ایم۔ اے (انگریزی) کے مقابلے میں بہت غنیمت ہے۔

علی گڑھ میں بی۔ اے انگریزی کا نصاب بھی مشکل تھا۔ پہلے سال اردو، دینیات کے علاوہ انگریزی زبان کا بھی ایک پرچہ لازمی تھا۔ جس میں تین کتابیں تھیں۔ دوسرے سال شکسپیئر کے دو ڈرامے، جدید انگریزی شعراء سے متعلق دو کتابیں، نثر کی کئی کتابیں، جدید ڈراما وغیرہ داخل نصاب تھا۔ فارسی نثر و نظم محترم ضیاء احمد بدایونی جیسے فاضل پڑھاتے تھے۔ تاریخ پروفیسر عبدالرشید پڑھاتے تھے۔ بہت تیاری کر کے آتے تھے۔ بنگالی عبدالحلیم صاحب (۲) (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے)۔ تاریخ کی تمام Tutorial classes لیا کرتے تھے۔ تاریخ کے نصاب میں A short history of Muslim Rule in India ایشوری پرشاد کی تھی جو پہلے بچوں کے لیے تاریخ لکھا کرتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اورنگ زیب، چار وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ (ایسی غلطیاں اس کتاب میں کئی جگہ ہیں)۔ تاریخ میں Roberts کی برٹش پیریڈ، Lanepoole کی Ottoman Empire۔ جسٹس امیر علی کی History of Saracens وغیرہ داخل نصاب تھیں۔ تاریخ کی ان تمام کتابوں کے خلاصے میں نے اور مدراس کے حبیب اللہ بیگ نے مل کر تیار کر لیے تھے۔ تاریخ کے لیے دوسری کتابیں بھی تھیں جو غیر نصابی تھیں لیکن بہت مفید تھیں۔ پھر اس موضوع کے لیے مولانا ابو بکر محمد شیث صاحب اور مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جیسے بزرگوں سے بھی رجوع کیا جاتا تھا۔

---

(۱) سید محمد صاحب ٹریفک پولیس کے بہت اعلیٰ افسر تھے۔ ریٹائر ہو کر اب اسلام آباد میں ہیں۔ ان سے چھوٹے بھائی کرنل سید مصطفےٰ صاحب ہندوستان میں ہیں اور سب سے چھوٹے سید حامد صاحب، کمشنر، سکریٹری پھر علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو سلامت باکرامت رکھے آمین۔

سید محمد صاحب کی منگنی علی گڑھ میں ۱۹۳۱ء کے اواخر میں ہوئی تھی۔ شرم کی وجہ سے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن بار بار شاہد صاحب مٹھائیاں لاتے تھے اس لئے اندازہ ہو گیا تھا۔ سید محمد صاحب اپنے گھر سے گھڑا بھر کر رساول لایا کرتے تھے۔ خود بھی عمدہ قورمہ پکا لیتے تھے۔ ان کی اہلیہ صاحبہ بہت خوش مزاج ہیں۔ ہمیشہ ان کو چھیڑتی رہتی ہیں۔ پروفیسر وقار عظیم مرحوم، سید محمد صاحب کے ہم زلف تھے۔

(۲) ان کو گانے کا بہت شوق تھا۔ بی ٹی کے استاد وحید الحق صدیقی صاحب کے مکان پر اپنا شوق پورا کرتے تھے۔ بعد میں وہ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں استاد مقرر ہوئے۔ اتفاق سے تاریخ کے ایک مقالے کا ان کے ساتھ ایک ممتحن میں بھی تھا۔

انگریزی میں مختار حامد علی صاحب ہم لوگوں کے ساتھ بڑی محنت کرتے تھے۔ Tutorial classes بھی خود لیتے تھے۔ بہت سنجیدہ اور باوقار تھے۔ دبلے پتلے تھے اور ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے۔ پڑھاتے وقت ان کے منہ میں ایک طرف جھاگ بھی جمع ہو جاتا تھا۔ لیکن کبھی تھکاوٹ ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے استاد محمود حسین صاحب تھے وہ بعض حروف حلق سے ادا کرتے تھے تو یار لوگ ان کو قاری محمود حسین کہتے تھے وہ عموماً Golden Treasury پڑھاتے تھے۔ ایک اور استاد پارسی تھے۔ ڈراب جی نام تھا۔ بڑے با اخلاق اور محنتی تھے۔ Galsworthy کا ڈراما بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ انگریزی کی ایک کتاب John Buchan کی The path of the King تھی۔ زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے بہت مشکل تھی۔ لڑکے پریشان تھے۔ بفضلہٖ تعالیٰ میں نے اس کا خلاصہ بنا لیا تھا جس سے طلبہ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔

اوپر عرض کیا ہے کہ سید محمد صاحب کے ساتھ S.S.West ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۸ میں میرا بھی قیام تھا۔ وہ کمرہ ایسا تھا کہ اس کی پشت کے جالی کے دروازے سے کرکٹ اور ہاکی وغیرہ کے میچ بیٹھے ہوئے بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ کرکٹ کے اکرم ریاض Wicket keeper موٹے اور بھاری بھرکم تھے۔ وہ Burgo master کہلائے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی دلچسپی کی خاطر، وارڈن صاحب سے کہہ کر ہمارا کمرہ خالی کرا لیا تھا اور ہم لوگوں کو Tower gate کے قریب کمرہ نمبر ۴۴ دلوا دیا۔ سید محمد صاحب اس کمرے میں چلے گئے اور میں عثمانیہ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۷ میں منتقل ہو گیا۔ وہاں جبل پور کے ضامن علی اور افضال علی تھے۔ افضال علی چند ماہ کے بعد تعلیم چھوڑ کر ملازمت کے لیے چلے گئے تو فدا حسین ان کی جگہ آ گئے۔ عثمانیہ ہوسٹل آتے ہی ایک لطیفہ درپیش ہوا۔ ایک صاحب بہت موٹے تھے۔ یار لوگ انہیں Filter کہا کرتے تھے۔ وہ ایک دن فرمانے لگے کہ اس (عثمانیہ ہوسٹل) میں میری اجازت کے بغیر کوئی Activity نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے سید محمد صاحب سے کہا کہ آج ان صاحب کی اجازت کے بغیر انہیں پر Activity کی جائے۔ سید محمد صاحب عمدہ پختہ سرخ رنگ بازار سے لائے۔ اسے پانی میں خوب پکاتے رہے۔ پھر رات کو فلٹر صاحب کو اس رنگ سے غسل دلا دیا۔ سید محمد صاحب رنگ پھینک کر کمپاؤنڈ کے مشرقی دروازے سے باہر کود کر چلے گئے۔ ہم لوگ فلٹر صاحب سے ہمدردی کرنے کے لیے جمع ہو گئے کہ ان کی اجازت کے بغیر کس نے ان کو رنگین غسل دلایا۔ ہم لوگ اس کی خبر لیں گے۔ ایک اور لطیفہ بلاوجہ وجود میں آ گیا۔ ہمارے چند کمروں کے لیے عبدالمجید خدمت گذار تھا۔ رمضان شریف کا زمانہ آیا تو سحری کے وقت فیرنی بھی آنے لگی۔ کمرے میں ایک الماری تھی۔ اس میں کھانا اور فیرنی رکھی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا

کہ عبدالمجید فیرنی کے ساتھ شوق فرمارہے تھے۔ منہ اور ہاتھ دونوں مصروف تھے۔ عبدالمجید کی پیٹھ میری طرف تھی۔ چنانچہ اس کی پیٹھ کا ڈھول بجایا گیا۔ پھر تو وہ مجھ سے خائف رہنے لگا کہ جن طلبہ کا کام وہ ٹال دیا کرتا تھا میرے کہنے پر مجبوراً کرنے لگا۔

عثمانیہ ہوسٹل میں آتے ہی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو انعام حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ جامع مسجد میں (جو ساتھ ہی تھی) بعد عصر کے، مولانا سید سلیمان اشرفؒ (م ۱۳۵۸ھ) کے درس تفسیر میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور دوسرا انعام یہ ملا کہ اسی زمانہ میں ۱۹۳۱ء میں استاذ القراء قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادی (م ۱۳۷۱ھ) کا تقرر تجوید و قراءت پڑھانے کے لیے ہوا تو مغرب کے بعد ان کے درس میں حاضری ہونے لگی۔ ان کا کمرہ جامع مسجد کے مشرقی حصے میں تھا۔ بفضلہ تعالیٰ جلد ہی تکمیل نصیب ہوئی۔ (گو کہ شاطبی شریف بعد میں ان سے پڑھی)۔

اسی زمانے میں (یعنی بی۔ اے کلاس میں) دو ساتھی غلام احمد خان نام کے تھے۔ ایک تو نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کے صاحبزادے تھے۔ جنھوں نے کچھ عرصے کے بعد اپنے نام میں مدنی کا اضافہ کرلیا تھا۔ دوسرے حیدر آباد (دکن) کے تھے۔ مدنی صاحب شرافت اور ذہانت کا مجسمہ تھے اور انھوں نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ نواب صاحب کے بیٹے ہیں۔ البتہ عثمانیہ ہوسٹل میں ان کا کمرہ پوری نوابی شان کا تھا جس کا فرنیچر بعد میں ایک وارڈن صاحب نے ان سے مانگ لیا تھا۔

عثمانیہ ہوسٹل کے خاص احباب میں محمد ممتاز (گھرگ پوری)، نبی احمد (بہاری) اور عبدالقادر تھے۔ عبدالقادر بہت خوش الحان تھے اور یونی ورسٹی کی اکثر تقریبات میں وہی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن سونے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مجھ سے کہتے کہ فلاں کتاب میرے ساتھ پڑھو۔ میں کتاب شروع کرتا اور وہ سونا شروع کرتے۔ بار بار ان کو جگاتا لیکن سونے سے باز نہیں آتے تھے۔

حبیب اللہ بیگ صاحب (جن کا اوپر ذکر آچکا ہے) مدراس کے رہنے والے تھے۔ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ میرے ساتھی ضامن علی ان کی شان میں کہا کرتے تھے:۔ حبیب اللہ بیگ۔ پکائی دیگ۔ دیگ میں نکلا ناگا۔ حبیب اللہ مدراس کو بھاگا۔

مدراس کے ایک طالب علم Y. Mohammad تھے۔ بہت سیدھے اور بھولے تھے۔ اردو بہت کم جانتے تھے۔ یار لوگ ان کو بہت چھیڑتے تھے۔ ایک صاحب اکثر لحاف اوڑھ کر پڑے رہتے تھے۔ ان کا نام "مولانا فی لحاف" ہو گیا تھا۔ ایک نسیم مرزا رزقی تھے (ڈاکٹر بابر مرزا صاحب کے عزیز تھے)۔ ان کو مرزا پھوپا (پوپا) کہا جاتا تھا۔ وہ ایم ایس سی Physics کے واحد طالب علم تھے۔ بعد میں مجبوراً پاس کیے گئے یعنی "تھرڈ کلاس پاس" ہوئے۔ ایک منظور الامین

حیدر آباد (دکن) کے تھے۔ مجھ سے بڑی دوستی تھی۔ بہت پڑھتے تھے۔ کیونکہ "کمبخت کتابیں" بہت مشکل سے انھیں یاد ہوتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ میری بیوی (وطن میں) مجھ سے ناراض ہے۔ اس سے میری سفارش کردو۔ چنانچہ میں نے ان کی بیوی کو ایک منظوم خط اس طرح لکھا:۔

دوست میرے ہیں جو منظور الامیں خود کو ظاہر کرتے ہیں اندوہ گیں
خوب کھایا کرتے ہیں زردہ پلاؤ مجھ سے کہتے ہیں کہ آؤ تم بھی کھاؤ
ناشتے میں پوریاں کھاتے ہیں چار کھانے میں سب مان لیں گے ان سے ہار
ماش کی دال ان کو بس مرغوب ہے خود پکالینے کی عادت خوب ہے
ہے کسی کا ایک شعر ان کے لیے سن لیں بھابھی جان اس سن کے لیے

"فراق یار میں گھل گھل کے ہوگئے ہاتھی
ہزار گز کی قبا پاؤں تک نہیں آتی

معلوم نہیں اس خط کے پہنچنے پر بھائی منظور الامیں کو کیا ڈانٹ پڑی۔ وہ عرصے تک خاموش ہی رہے اور ہم لوگ ان کو چھیڑتے ہی رہے۔ ع چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ پھر کئی سال کے بعد حیدر آباد دکن میں ان کے در دولت پر بھی حاضر ہوا تھا۔

ایک "جگت دوست" مختار جمیل بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ہر محفل میں خوش باش اور حاضر باش تھے۔ بڑی ڈاڑھی تھی۔ نماز کے سخت پابند تھے۔ ہاکی کے کھلاڑی تھے۔ کبھی کبھی کرکٹ بھی کھیل لیتے تھے۔ کبھی کوئی گیند روک لیتے تھے تو ہر طرف سے "جمیل میاں فیلڈڈ" کی آوازیں آتی تھیں۔ گانے کے شوقین تھے۔ داغ کی یہ غزل بل بل کر سناتے تھے:۔

مرے خط کا جواب آئے نہ آئے پیامِ کامیاب آئے نہ آئے

اسی زمانے میں مجھ سے ایک کام شیخی کا ہوگیا۔ ہوا یہ کہ بعض احباب کے ساتھ دولت راؤ سندھیا کے قلعے کی طرف جانا ہوا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ اس قلعے کی دیوار سے کون کود سکتا ہے؟ میں نے شیخی میں کہہ دیا کہ میں کود سکتا ہوں۔ میں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا اور میں کود گیا۔ شکر ہے کہ ہاتھ پاؤں سلامت رہے لیکن کمر میں اس زور کا جھٹکا لگا کہ میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ بڑی ہمت کرکے اٹھا اور سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اسی جگہ دیر تک ڈنڈ بیٹھک لگاتا رہا اور بعد میں قریب تین میل کی دوڑ لگائی۔ لیکن ۱۵۔ ۲۰ دن تک کمر میں درد رہا۔ شرم کی وجہ سے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا اور ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گیا۔ بحمداللہ پھر آرام ہوگیا۔ اسی زمانے میں میری آنکھیں بھی کمزور ہوگئیں تو ایک دوست

کے مشورے پر میں نے سونف بہت کھائی جس سے بفضلہٖ تعالیٰ میری آنکھیں اب تک اچھی ہیں۔

علی گڑھ میں اب سر راس مسعود صاحب وائس چانسلر ہوئے۔ انہوں نے اکثر شعبوں میں مغرب کے اُستادوں کو بھر لیا۔ حتیٰ کہ شعبہ عربی میں Dr. Otto Spies (جرمن) کو لے لیا(۱) حالانکہ ان سے زیادہ قابل لوگ اس شعبے میں موجود تھے۔ البتہ شعبہ جغرافیہ میں قاضی جلال صاحب کی جگہ ڈاکٹر عبادالرحمٰن صاحب کو لے لیا۔ ان کی وجہ سے شعبے کو بہت ترقی ہوئی اور دور دور سے آکر طلبہ نے داخلہ لیا۔ قاضی جلال صاحب بہت خوش مزاج تھے۔ وہ بہت سے انگریزی الفاظ کو اردو کا رہینِ منت کہا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں ایک شخص عصا ٹیک کر جا رہا تھا تو اس سے Stick لفظ بن گیا۔ Decoration "ڈیکھو رے شان" سے بنا ہے۔ Toleration "تالو رے شان" سے بن گیا ہے۔ Corporation دراصل "کار پریشان" سے ہے۔ غرض کہ ان کو خوب سوجھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

باہر سے درآمد کیے جانے والے اساتذہ میں ایک G.C. Woods بھی تھے۔ وہ اپنی حرکات و سکنات سے بھی جنگل کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ وہ یونی ورسٹی اسکول کے پرنسپل بنائے گئے۔ لڑکوں نے ان کو تماشا بنا لیا تھا اور ان کے بنگلے کا سائن بورڈ (جس پر ان کا نام لکھا ہوا تھا) عثمانیہ ہوسٹل کے عقب میں برگد کے درخت کے نیچے ایک مزار پر لگا دیا تھا۔

میں بی اے فائنل میں پہنچا تو مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ میری عادت تھی کہ اکثر کلاس میں استادوں کا ایک ایک لفظ اپنی کاپی پر لکھ لیتا تھا اس لیے مجھے امتحان کی تیاری میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی اور اکثر طلبہ مجھے گھیرے رہتے تھے۔ چنانچہ فجر کی نماز اور تلاوت سے فارغ ہوتا تو کچھ طلبہ آجاتے۔ ان سے فارغ ہوتا تو ۸ بجے سے ایک بجے تک یونی ورسٹی کی کلاسوں میں مصروف رہتا تھا۔ وہاں سے آکر کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھتا تھا۔ پھر کچھ احباب (بالخصوص بہار کے نبی احمد اور سندھ کے شیخ غلام حسن) فارسی پڑھنے آجاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد تفسیر کے درس میں شریک ہو جاتا تھا۔ میرے ایک دوست انتظام الدین، ریلوے اسٹیشن کے قریب محلہ شاہ کمال میں رہتے تھے۔ انہوں نے انگریزی مضمون کی تیاری نہیں کی تھی(۲) اس لیے مغرب سے عشاء تک ان کی تیاری میں مصروف

(۱) Dr. Otto Spies قدآور ملنسار تھے۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے شہاب الدین سہروردی مقتول (م ۵۸۷ھ) کا فارسی رسالہ مونس العشاق شائع کیا تھا۔ ایک نسخہ مجھے بھی دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جرمنی میں اتنے پی ایچ ڈی ہیں جتنے اس ملک میں میٹرک ہیں۔

(۲) اس زمانے میں انگریزی کے ایسے جملے بنانے کا شوق تھا:۔

(1) Round and round the rugged rocky rampers the riding ruler ran.

(2) Down did he dwell in the depths of despair and despondency.

(3) Pooh, pernicious poverty predicted perdition to the public.

رہتا تھا۔ پھر واپس اپنے کمرے کو آتا تھا۔ ایسی مصروفیات سے مجھے ان تھک زندگی کا حوصلہ ملا۔ اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر کروں کم ہے۔

۱۹۳۲ء میں کتاب "انگارے" شائع ہوئی تو علی گڑھ شہر سے ایک ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبار اس کے خلاف شائع ہوا۔ مدیر کا نام تو یاد نہیں رہا(۱) لیکن اخبار کا نام خشماف یاد ہے جو خان بہادر شمس العلماء مولانا ابوالفداء کے ہر پہلے حرف کا مجموعہ تھا۔ اس میں ایک مستقل باب "آگ کھائیں انگارے ......" ہوا کرتا تھا۔ دہریت کے لیے جو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا اور صرف بے حیائی والے قصوں کو شائع کرنا Realism کہا گیا تھا(۲) اس کے خلاف اس اخبار میں مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ یونی ورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب اس نئے شوق کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے Realism کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کیمبرج یونی ورسٹی پریس نے شائع کی تھی۔ وہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں "کتاب حوالہ" کے طور پر داخل نصاب تھی۔ ملحد قسم کے نوجوان اس کتاب کو اپنے لیے مضر سمجھتے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی اسلام دوستی سے پریشان تھے۔ ایسے نوجوان، معاشرے کی منافقت اور مداہنت کو بے نقاب کرنے کے دعویدار تھے اور اسی مقصد کو وہ Realism سمجھتے تھے۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے فائنل کا امتحان ہوا۔ میرا رول نمبر ۱۴ تھا۔ مجھے بھی اچھے نمبر ملے۔ لیکن غلام احمد مدنی (نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کے صاحبزادے) سب سے اول رہے ان کا رول نمبر ۱۳ تھا۔ وہ پہلے بھی ہمیشہ ہر کلاس میں اول پاس ہوتے رہے۔ میرٹھ سے میٹرک اور انٹر پاس کیا تھا اور دونوں میں اول آئے تھے۔ ماشاءاللہ۔

ایم۔ اے کا زمانہ :۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد محمد ممتاز (کھرگ پور والے) اور چودھری عبدالحمید (جالندھر والے) کے ساتھ میں نے بھی ایم۔ اے (فارسی) کلاس میں داخلہ لے لیا۔ غلام احمد مدنی صاحب نے بھی (غالباً) داخلہ لے لیا تھا لیکن وہ کلاس میں نہیں آتے تھے اور انڈین سول سروس کے امتحان کی تیاری میں مشغول رہتے تھے۔ شعبہ فارسی کے صدر جناب ڈاکٹر ہادی حسن صاحب تھے۔ نہایت حسین و جمیل، خوش پوشاک، خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے۔ ایرانی ماں کے سپوت تھے۔ بے حد

(۱)۔ ڈاکٹر مختار الدین صاحب نے فرمایا کہ اخبار کا نام فرحتی تھا اور اس کے مدیر مولانا ابرار حسین فاروقی ازہری تھے جو ابھی چند سال پہلے فوت ہوئے ہیں غالباً وحیداللہ احرار بھی اُن کے ساتھ تھے۔

(۲) علی گڑھ گرلس کالج سے تعلق والوں کو اس نئے رجحان سے زیادہ تعلق پیدا ہوا۔ اسی کالج کا سیاہ برقع (مصر کی تقلید میں) پورے ملک میں پسندیدہ ہوا۔ وہاں کے بعض الفاظ ابو۔ امّی آپا۔ (استانی کے لئے) اور باجی وغیرہ بھی عام ہوئے۔

صحت مند تھے۔ فرماتے تھے کہ "کیمبرج میں بی۔ اے آنرز اور بی ایس سی آنرز کے زمانے جارج پنجم کا بیٹا ایڈورڈ (جو شادی کی خاطر تخت سے دستبردار ہوا اور بعد میں Duke of Windsor کہلایا) میرے ساتھ تھا۔ میں نے ایک سخت مشکل کتاب شروع سے آخر تک رٹ ڈالی تھی لیکن ...میں اس کو اول قرار دیا گیا اور مجھے دوم"۔

ڈاکٹر صاحب نے بعد میں لندن سے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ فارسی اور انگریزی ان کے قدم ...تی تھی۔ تقریر اس قدر دلپذیر ہوتی تھی کہ ان زبانوں کے نہ جاننے والے بھی ہمہ تن گوش بن جاتے تھے۔ Persian Navigation ان کی پہلی کتاب تھی جو کئی مقالوں پر بھاری تھی۔ پھر ...د کتابیں لکھیں۔ انگریزی ایسے لکھتے تھے کہ انگریز بھی شرما جاتے تھے۔ پونا کے (Ferguson Coll... کے پرنسپل F. W. Bain جو Figurative style کے لیے مشہور تھے۔ ان کی ...ل کے جملے ڈاکٹر صاحب کو ازبر تھے۔ اور اپنی تقریر میں ان کو اس خوبی کے ساتھ شامل کر لیتے تھے ...ی کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ جملے کسی اور کے ہیں۔ انداز بیان میں اس قدر دلکشی تھی کہ اگر کوئی ...فر اس وقت بولنے والے ہوتے تھے تو حاضرین کو صرف ڈاکٹر صاحب کی تقریر سننے کا اشتیاق غالب ...تھا۔ بی۔ ٹی کالج کے پرنسپل غلام السیدین صاحب (جو خود بھی بہت ذہین تھے) ڈاکٹر صاحب کو Stage Dramatist کہا کرتے تھے۔ جدید فارسی میں پورے ملک میں ان کی طرح شاید کوئی ماہر نہ ...۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ تم بھی بہت سی تحریریں رٹ لیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ...آن پاک حفظ کیوں نہیں کر لیتے؟ انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ میں ایک تہائی قرآن حفظ کر چکا ...ہوں (خدا کرے مکمل کر لیا ہو)۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمانے لگے کہ تم تذکرہ دولت شاہ کا انگریزی ...ترجمہ کر ڈالو۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں قریب نصف کتاب کا ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت ...ش ہوئے اور عرصے تک وہ ترجمہ اپنے پاس رکھا۔ ان کا انگریزی خط اور نستعلیق خاص طرز کا تھا اور ...حسین تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت با اخلاق اور بہت بامروت تھے۔ اس کا ثبوت ان کی اہلیہ تھیں۔ ...کے متعلق لوگ عجیب عجیب قصے بیان کرتے تھے۔ محترمہ کو ہم لوگوں نے ان کے بنگلے میں یا باہر کبھی ...ں دیکھا۔

شعبے کے دوسرے استاد لفٹنٹ حاجی حمیدالدین صاحب تھے۔ وقت کے سخت پابند۔ پڑھائی ...گھنٹہ شروع ہوتے ہی فوراً پڑھائی شروع کر دیتے تھے اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی فوراً پڑھائی ختم کر دیتے ...خواہ جملہ بھی ادھورا چھوڑ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ تم فلاں جگہ (غالباً) نو بج کر دس ...منٹ پر مجھ سے ملنا۔ مجھے ۲۔ ۳ منٹ کی دیر ہو گئی تو وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لیکن بہت ہمدرد اور ...خوش گوش تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ تم لیڈر بننا۔ ۱۹۳۵ء میں جب کہ ہم لوگوں کا فائنل کا امتحان ہونے والا تھا وہ ریٹائر ہوئے اور فرمانے لگے کہ مجھے اپنے مضمون (فارسی) سے کوئی خاص دلچسپی نہیں

تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت محنت اور دیانت کے ساتھ پڑھاتے تھے۔

تیسرے استاد فاضل یگانہ ضیاء احمد بدایونی صاحب تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں اور ان کے ادب پر اتنا عبور حاصل تھا کہ خود ان مضامین کے پڑھانے والے ان کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ بخار کی حالت میں بھی وہ پڑھانے کے لیے تشریف لے آتے تھے اور اس قدر محنت سے پڑھاتے تھے اور ایسے نکات بیان فرماتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شعر و شاعری ان کے گھر کی لونڈی تھی اور مخطوطات کی قرأت ان کے لیے ذرا بھی مشکل نہ تھی۔ ان کی اس صلاحیت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا جب کہ بعض عربی اشعار (جن کی تصحیح ہمارے ملک کے بعض سب سے بڑے فضلاء نہ کر سکے تھے) قبلہ ضیاء احمد بدایونی صاحب نے فوراً سمجھا دیے اور صحیح کر دیے۔ اسی زمانے میں نیویارک (امریکہ) سے بہائیوں کی طرف سے ایک مقالہ لکھنے کی دعوت آئی۔ موضوع تھا:۔

How can youth contribute to the realisation of a Universal religion ?

میں نے فارسی میں مقالہ لکھا اور بہائیوں کی خوب خبر لی۔ قبلہ ضیاء احمد صاحب نے پسند فرمایا۔ پھر بہائیوں نے بھی میرے مقالے کی خوب تعریف کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا مقالہ ان کے خلاف تھا اس لیے انعام مجھے کب دے سکتے تھے؟

اسی زمانے میں California یونی ورسٹی سے ایک خط آیا کہ اگر کوئی طالب علم تحقیقی مقالہ پرائیویٹ طور پر بھی تیار کرے گا تو ہم اسے ڈگری دے سکتے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ فارسی میں لکھوں لیکن بعض حضرات نے رائے نہیں دی، کیونکہ اس زمانے میں برطانیہ کے مقابلے میں امریکہ کی وقعت نہیں تھی۔

قبلہ ضیاء احمد صاحب کا نستعلیق اور انگریزی خط بہت پاکیزہ تھا اور جلد جلد لکھنے میں بھی ان خطوں کے حسن میں کوئی فرق پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس زمانے میں ایم۔ اے کے ساتھ ایل ایل بی کلاس میں بھی داخلہ لیا جا سکتا تھا جو مغرب کے بعد ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس کلاس میں بھی داخلہ لے لیا۔ مولانا عبدالخالق صاحب شعبے کے صدر تھے۔ بیرسٹر الحق خسرو اور بیرسٹر الحق خواجہ بھی استاد تھے۔ میں اکثر نامدار خان صاحب (۱) کے

نامدار خان نے علی گڑھ میں ایم۔ اے (ریاضیات) پاس کر لیا تھا لیکن اپی۔ بس مرا انساء کو فرسٹ ایئر کلاس میں گرلز کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ اس لیے دو سال کی مدت گزارنے کے لیے انہوں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا۔ بہت ذہین تھے۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر گوندیا (سی۔ پی) میں وکالت کرتے رہے، پھر پاکستان بننے کے بعد حیدر آباد (سندھ) میں بہت نامور وکیل تھے۔ وہیں ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے جمیل آج کل انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔

ساتھ بالکل اگلی صف میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے کچھ دیر ہو گئی تو میں آخری صف میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک فلیٹ کیپ میری ڈیسک پر آگئی۔ بات یہ تھی کہ ہندو طلبہ اگر ترکی ٹوپی نہ پہننا چاہتے تو انہیں فلیٹ کیپ پہننے کی اجازت تھی۔ ایک ہندو طالب علم نے اپنی ٹوپی ڈیسک پر رکھ دی تھی تو ایک طالب علم نے شرارت سے اسے اٹھا کر پیچھے کی ڈیسک پر پہنچا دیا تھا۔ وہاں سے اور پیچھے کی ڈیسک پر آئی اور مختلف ڈیسکوں سے ہوتی ہوئی میرے پاس آگئی تھی۔ میں اسے لے کر باہر چلا آیا تو یار لوگوں نے اس کی فٹ بال کھیل ڈالی اور اس کے چیتھڑے اڑ گئے۔ دوسرے دن ان چیتھڑوں کو لے کر میں کلاس میں پہنچا اور ایک پرچہ لکھا کہ "پنڈت جی بہت افسوس ہے کہ آپ کی ٹوپی کی میری دوستوں نے فٹ بال کھیل ڈالی۔ اب جو کچھ بچی ہے آپ کی خدمت میں واپس کرتا ہوں"۔ نامدار نے وہ رقعہ اور چیتھڑے (نظر بچا کر) بیرسٹر اسحٰق خسرو صاحب کی میز پر رکھ دیے۔ وہ بہت گراں گوش تھے۔ انہوں نے وہ رقعہ دیکھا تو پڑھ کر طلبہ کو سنایا۔ پوری کلاس میں قہقہے لگنے لگے۔ وہ پنڈت جی (جن کی ٹوپی تھی) کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے کہ وہ ٹوپی میری ہے اور میں وائس چانسلر کو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب نے کچھ سنا نہیں۔ لیکن فرمایا کہ کلاس سے فارغ ہو کر میرے پاس آؤ۔ کلاس ختم ہوئی تو پنڈت جی نے وہی بات کہی کہ میں وائس چانسلر کو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب بالکل نہ سن سکے۔ انہوں نے قریب کے طالب علم سے پوچھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ طالب علم نے کہا کہ یہ فرماتے ہیں کہ میری ٹوپی ایک روپے کی تھی۔ روپیہ دلوایے۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا میں تو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب پھر نہ سن سکے تو قریب والے طالب علم نے کہا کہ آپ فرماتے ہیں کہ روپیہ نہیں تو اٹھنی دلوا دیجیے۔ بیرسٹر صاحب نے پھر بھی کچھ نہ سنا تو اسی طالب علم نے کہا کہ آپ فرماتے ہیں کہ کم از کم چار آنے تو دلوا دیجیے۔ بیرسٹر صاحب نے فرمایا I shall pay you four annas. لیکن اندازہ لگا لیجیے کہ اس پورے مکالمے میں طلبہ کا قہقہوں کی وجہ سے کیا حال ہوا ہو گا۔ پنڈت جی پریشان ہو کر چلے گئے اور طلبہ بڑی دیر تک قہقہوں سے ان کی پذیرائی کرتے رہے۔

اس زمانے میں Ramsbotham پرو وائس چانسلر تھے۔ ترکی کی پہلی جنگ عظیم کے امیر البحر رؤف بے، علی گڑھ یونین کو خطاب کرنے کے لیے آئے تھے۔ یونین کے وائس پریذیڈنٹ عنایت اللہ تھے۔ کاٹول (ناگ پور) کے رہنے والے تھے۔ جوش میں آکر انہوں نے کہہ دیا :-

These dogs of Christians have got Bible on their lips but devil in their hearts.

پرو وائس چانسلر ناراض ہو کر کھڑکی ہی سے نکل کر باہر چلے گئے۔ ہم لوگ گھبرا گئے کہ وہ کوئی تادیبی کارروائی نہ کریں۔ لیکن شکر ہے کہ ان کو جرأت نہ ہو سکی۔ حالانکہ اسی زمانہ میں Discipline تادیب کا ایک سخت واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک پروفیسر کے بنگلے میں بجلی کی چوری کا ثبوت ملنے پر انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

اسی زمانے میں قادیانیوں نے (قادیانی استادوں اور قادیانی طلبہ نے) مرزا بشیراحمد کو علی گڑھ آنے کی دعوت دے دی۔ کچھ مسلمان طلبہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری (ناظم دینیات) (م ۱۳۵۹ھ) کی طرف سے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کو تار دیدیے کہ آپ لوگ جلد تشریف لائیں۔ (پھر مولانا ابوبکر صاحب سے معذرت کرلی۔ لیکن وہ بہت خوش ہوئے)۔ مرزا بشیراحمد علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پہنچ چکا تھا لیکن ان دو بزرگوں کی آمد کی خبر سنتے ہی واپس چلا گیا۔ ان دو بزرگوں نے پھر ایسی دُھنواں دھار تقریریں کیں کہ عرصے تک کے لیے قادیانیوں کی ہمت پست ہو گئی۔

اسی سال دسمبر ۱۹۳۳ء میں جب All india English Debate کا انعقاد ہوا تو رام پور حامد ہال کی گیلری کے ایک حصے میں کالج کی لڑکیوں کے لیے پردہ کر دیا گیا۔ ایک لڑکی بہت شریر تھی۔ پردے کے قریب متھرا کے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لڑکی نے بڑی چابکدستی سے ان کی ٹوپی کھینچ لی۔ دوسرے دن وائس چانسلر صاحب کا عتاب نامہ آیا کہ جن لڑکوں نے ہال میں شرارت کی ہے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ یعنی شرارت تو لڑکی نے کی تھی لیکن لڑکیوں کی پرنسپل صاحبہ نے لڑکوں کو غلط ڈانٹ دلوا دی۔ لڑکے بہت چراغ پا ہوئے لیکن قہرِ درویش بر جان درویش۔ بے چارے صبر کر کے رہ گئے۔

اسی زمانے میں حفیظ جالندھری آئے تھے۔ شاہنامہ اسلام کے اشعار اپنے مخصوص انداز میں سناتے رہے۔ اساتذہ اور طلبہ بہت محظوظ ہوئے اور ان کے کمال کا اعتراف عرصے تک کرتے رہے۔

اسی زمانے میں قاہرہ سے خالد شیلڈرک Khalid Sheldrake آئے تھے۔ انہوں نے اباؔ حلیم (A.B.A. Halim کو ہم لوگ اباؔ حلیم کہتے تھے)۔ کے ذریعے اپنی مالی امداد کیلیے درخواست کرائی۔ اباؔ حلیم اب پرو وائس چانسلر تھے اور بہت باوقار تھے۔ طلبہ نے حتی الامکان ان صاحب کی خدمت کی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ قاہرہ جا کر Minaret اخبار، طلبہ کو بھیجا کریں گے۔ لیکن انہوں نے نہیں بھیجا۔ میں نے انہیں قاہرہ بھی خط لکھا تھا۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جس زمانے میں علی گڑھ آئے تھے تو رمضان المبارک کا مہینا تھا۔ وہ دن میں سگریٹ پی رہے تھے

کہ ان کے علماء کا اسی طرح کا فتویٰ تھا۔ علی گڑھ میں ذاتی مقاصد کے لیے ایسے لوگ آتے رہتے تھے۔ امریکہ سے ایک بازی گر آیا۔ اشتہار تھا:۔ .A man with thousand faces اسٹریچی ہال میں مظاہرہ ہوا۔ ٹکٹ خرید کر داخلہ ملا۔ وہ شخص منہ بنا بنا کر ہنساتا تھا۔ اور کچھ نہ تھا۔ امریکہ سے ایک صاحبہ بھی آئیں۔ شکل واجبی سی تھی۔ حامد ہال میں تقریریں کیں اور اپنا ذاتی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ گویا اپنی سکینت کے لیے ایسی کرامت دکھلائی تھی۔

اپریل ۱۹۳۴ء میں اسٹریچی ہال میں امتحانات شروع ہوئے تو ایک لطیفہ ہو گیا۔ پہلے دن ایم اے (فارسی) کے فائنل کا امتحان تھا اور وہیں بی۔ اے کی فارسی کا امتحان بھی اسی دن تھا۔ دونوں کے امتحانی پرچوں میں نظام عروضی کے چہار مقالہ کے اقتباسات تھے۔ ایم۔ اے کے پرچوں کا کاغذ نیلا ہوتا تھا اور بی۔ اے والوں کا سبز ہوتا تھا۔ منظور حسین شور صاحب (جو بعد میں سی۔ پی میں پروفیسر ہوئے اور مشہور شاعر بھی ہیں) مجھ سے ایک سال سینیئر تھے۔ وہ ایم۔ اے کا امتحان دینے گئے تو تین گھنٹے تک بی۔ اے کا پرچہ حل کرتے رہے۔ امتحان ختم ہوا تو غلام احمد مدنی صاحب کے ساتھ میں بھی کیفیت دریافت کرنے کے لیے گیا تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں بی۔ اے کا پرچہ تھا۔ ہم سب کو پریشانی ہوئی۔ مدنی صاحب فوراً اپنے والد نواب اسمٰعیل صاحب کے پاس گئے اور سب حال بتایا۔ نواب صاحب بنفس نفیس تشریف لائے اور منظور حسین صاحب کو ہال میں بٹھا کر ایم۔ کا پرچہ پہنچایا۔ تسلی دی۔ پھر کھانے اور مشروبات بھیجے۔ اس طرح ان کا پرچہ کرایا گیا۔

۳۴۔ ۱۹۳۳ء کا تعلیمی سال میں نے اور میرے بعض احباب نے مارلیسن کورٹ میں گزارا۔ وہاں کا وارڈن قادیانی تھا۔ اس سے ہم لوگوں کی بنتی نہیں تھی۔ مشورہ ہوا کہ اب یعنی ۱۹۳۴ء کے آخر سے مزمل ہوسٹل میں رہیں گے۔ غلام علی خان نے کہا کہ وارڈن صاحب کی کچھ تو خدمت کرتے چلیں۔ چنانچہ سرخ رنگ پانی میں گھول کر خوب پکایا گیا اور ان کے کمرے کی کھڑکی دفعۃً کھول کر ان کو اچھی طرح سے غسل دیا گیا۔ پھر ہم لوگ سائیکلوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے۔

مزمل ہوسٹل میں بڑا سکون تھا۔ اس کے ہال میں مسجد تھی۔ Introduction Party آئی۔ اس کے سربراہ کلیم الرحمٰن شیروانی تھے۔ میں کمرے کے باہر (گرمی کی وجہ سے) چارپائی ڈال کر سو رہا تھا۔ شیروانی صاحب کچھ چھیڑ کرنا چاہتے تھے لیکن جونہی میری شکل دیکھی بہت ادب اور محبت سے معافی مانگی۔ ان کے اخلاق سے علی گڑھ میں اور بعد میں کراچی کی ملاقاتوں میں دل بہت متاثر ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے بچوں پر رحم فرمائے۔ آمین۔

اس ہوسٹل میں ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کے امتحانات کی تیاری ہوئی۔ غلام علی خان،

بی ایس سی فائنل کی تیاری کرنے لگے۔ مدنی صاحب کی طرح وہ بھی کبھی اول پوزیشن سے کم میں پاس نہیں ہوئے۔ بی ایس سی، پھر ایم ایس سی (ریاضیات) میں بھی وہ اول آئے۔ بعد میں جب وہ کراچی آئے تو انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے حبیب بینک کے لیے ایسے قاعدے بنائے کہ ان کی وفات کے بعد آج بھی وہاں کے دستور العمل میں شامل ہیں۔ بڑی ہمت اور حوصلے والے تھے اور ہنوٹ میں بھی ماہر تھے۔ اس ہوسٹل کے قیام کے زمانے میں بھائی عبدالحمید صاحب جالندھری کی خصوصی محبت میرے لیے بڑی نعمت تھی۔ وہ عثمانیہ ہوسٹل سے برابر وہاں تشریف لاتے تھے۔ Riding Squad میں تھے تو گھوڑے پر سواری کی حالت میں آجاتے تھے اور آج تک دل کے آئینے میں ہیں۔ فضل حکیم، سمیع اللہ خاں (چترپاڑا، اترولہ، گونڈہ)، رضا علی خاں (بجے پور) اور بھائی انتظام الدین (علی گڑھ۔ محلہ شاہ کمال) خصوصی کرم فرما تھے۔ میرے کمرے میں ممتاز علی (جبل پور) تھے اور ساتھ والے کمرے میں عبدالحئی (کھرئی۔ ساگر) اور شوکت حسین انصاری (بھوپال) بہت تعلق رکھتے تھے۔ موسم گرما میں ہم لوگ تھانہ بنا دیوی کی طرف چلے جاتے تھے۔ وہاں خربوزے کی گاڑیاں آتی تھیں۔ ڈھائی روپے میں ایک گاڑی مل جاتی تھی۔ وہاں کھیت کے لوگ ہمارے لیے چارپائی بچھا دیتے تھے اور خربوزے کے بیج کے لالچ میں ہمارے خربوزے دھو کر اور کاٹ کر ہم کو دیتے جاتے تھے۔ ۶۔ ۷ لڑکے ایک گاڑی کے خربوزے کھا لیتے تھے۔ گاڑی اوسط درجے کی ہوتی تھی۔

امتحانات سے فراغت ہوئی تو رضا علی خاں نے مشورہ دیا کہ آپ اردو میں بھی ایم اے کرلیں۔ چنانچہ موسم گرما کی تعطیل کے بعد جون ۱۹۳۵ء میں وطن سے واپسی ہوئی تو میرے ساتھ ممتاز علی، سراج الحق اور (اس مرتبہ) صالح بھائی بھی تھے۔ جب ٹونڈلا جنکشن آیا تو میں نے سراج الحق سے کہا کہ اسٹیشن پر اپنے کوئی احباب ہوں تو یہیں بلا لو۔ یہ کہہ کر میں ظہر کی نماز ڈبے ہی میں پڑھنے لگا۔ سراج الحق ڈبے سے باہر گئے تو ایک ہندو کوتوال، اُس کا بیٹا اور ایک مسلح سپاہی ڈبے میں داخل ہوا۔ کوتوال کا بیٹا سراج الحق کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کوتوال اور سپاہی ذرا فاصلے پر بیٹھ گئے۔ سراج الحق واپس آئے اور مجھ سے کہا کہ کوئی احباب نہیں ملے اور پھر انہوں نے کوتوال کے لڑکے سے کہا کہ میری جگہ سے اٹھو۔ لیکن وہ اپنے باپ کی وجہ سے اکڑ میں تھا اور سوٹ پہننے کی شان میں بھی تھا۔ وہ ایک دم سراج الحق سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نماز میں تھا۔ جلد سلام پھیرا اور کوتوال کے بیٹے کی پیٹھ پر ایسے گھونسے رسید کیے کہ وہ ڈھیلا پڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن میرا آخری گھونسا اس کے باپ نے دیکھ لیا تو وہ مجھ پر لپکا۔ میں نے پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے جبڑے پر کیا تو وہ چکر کھا کر گر پڑا۔ خود میرا پنجہ مڑ

گیا۔ میں نے جلدی سے دوسرے ہاتھ سے اپنا پنجہ سہلایا۔ اتنے میں سپاہی نے میری طرف بندوق تان لی۔ میں نے اس سے بندوق چھڑالی۔ پھر تو وہ کانپنے لگا۔ ڈبے کے لوگ بھی گھبرا گئے۔ لیکن پھر ریلوے کے لوگ آگئے اور بیچ بچاؤ کر دیا۔ لیکن کوتوال صاحب کو جو گھونسا رسید ہوا تھا وہ انہیں برسوں یاد آتا رہا ہوگا۔

اسی سال غلام احمد مدنی صاحب کے .I.C.S کے امتحان کا نتیجہ آیا۔ وہ پورے ملک میں دوسری پوزیشن لائے۔ دلی مبارکباد کا خط میرٹھ کے پتے پر ان کو لکھا۔ (۱) انھوں نے بھی شکریہ کا خط مجھے فوراً بھیجا۔ سب احباب بہت خوش ہوئے۔

اس سال کئی خاص باتیں ظہور میں آئیں۔ شعبہ انگریزی کے قریب سے میں جا رہا تھا تو دیکھا کہ انگریزی کے استاد غلام سرور صاحب ایک تقریر سودا اور Southey کے تقابلی مطالعے پر کرنا چاہتے تھے لیکن سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ محترم استاد مختار حامد علی صاحب نے مجھے دیکھا تو فرمایا کہ کچھ لڑکوں کو پکڑ لاؤ تاکہ تقریر شروع ہو سکے۔ میں عثمانیہ ہوسٹل کے احباب کے پاس گیا اور بڑی تعداد میں ان کو وہاں جمع کر دیا۔ غلام سرور صاحب جب تقریر ختم کر چکے تو صدر شعبہ Hadow Haris تبصرہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مختار حامد علی صاحب اس کے ہر جملے پر قہقہہ لگاتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ میں نے مختار حامد علی صاحب کو پہلی بار قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں مجنوں گورکھپوری بی۔ اے کے لڑکوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ وہ ایک کلاس میں داخل ہوئے تھے کہ میں قریب سے گزرا۔ لڑکوں نے ان کے تخلص کی وجہ سے جملے کسنے شروع کیے اور وہ شور مچایا کہ ان کی ایک بات بھی نہ سنی۔ آخر بیچارے وہاں سے مایوس ہو کر یونی ورسٹی کے کسی اور کام پر لگ گئے۔

اسی زمانے میں ایک عجیب چیز دیکھنے میں آئی۔ وہ یہ کہ یونی ورسٹی اسکول کے سامنے چوراہے کے قریب نیم کے ایک درخت کی جڑ سے اس قدر پانی بہنا شروع ہوا کہ ایک نالا بن گیا۔ اس پانی کو معنی خون سمجھ کر دُور دُور سے لوگ آتے تھے اور اپنے برتن بھر کر لے جاتے تھے۔

ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ ہمارے ملنے والوں میں ایک صاحب بہت کنجوس تھے۔ ہم لوگوں کے پاس آکر کھاتے تھے لیکن کبھی کھلانے کے روادار نہیں تھے۔ ایک دن ان کی زبان سے سخاوت کے بے خیالی میں یہ جملہ نکل گیا کہ اگر کوئی شخص چار روٹیاں ایک ساتھ کھا لے تو میں اسے ایک روپیہ دوں

(۱) مبارکباد کا خط ریلوے اسٹیشن کے لیٹر بکس میں ڈالنے گیا تھا۔ ایک صاحب کی سائیکل لی تھی۔ وہ سائیکل وہاں سے کسی نے غائب کر دی۔ لیکن میں نے ان صاحب کو اس کا بدل پیش کر دیا تھا۔

گا۔ میں نے ممتاز علی سے کہا کہ ہمت کر ڈالو ورنہ کنجوس کا مال پھر نہیں ملے گا۔ ممتاز علی نے چاروں روٹیاں منہ میں بھر لیں۔ میں ہمت افزائی کرتا رہا۔ آخر وہ کامیاب ہو گئے اور چاروں روٹیاں کھا ڈالیں۔ اب تو کنجوس صاحب بہت گھبرائے۔ فرمانے لگے کہ اس روپے کی مٹھائی میں مجھے بھی شریک کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ آپ نے پہلے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ لیکن وہ بار بار وہی بات کہنے لگے تو میں نے کہا کہ بھائی اس کو شریک کر لو ورنہ وہ روپیہ بھی جائے گا۔ خیر وہ مجبور ہو گئے اور ان کے روپیہ نے انہیں داغ مفارقت دیا۔ لیکن جو مٹھائی آئی اس میں انھوں نے بڑھ بڑھ کر حصہ لیا۔

ایک دن احباب میں مشورہ ہوا کہ ریل سے آگرہ تو کئی بار ہو آئے ہیں اب سائیکلوں پر چلیں۔ چنانچہ شنبہ ۹ نومبر اور ۱۰ نومبر ۱۹۳۵ء کی درمیانی شب میں (ساڑھے گیارہ بجے) میرے ساتھ ممتاز علی اور صالح بھائی (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے) آگرہ کو روانہ ہوئے۔ اپنے ساتھ گپتی اور لاٹھیاں بھی رکھ لی تھیں، کیونکہ راستہ ڈاکوؤں کی وجہ سے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگوں نے ۵۳ میل کا راستہ طے کر کے فجر کی نماز اعتماد الدّولہ کے مزار کے قریب ایک مسجد میں ادا کی۔ آگرہ کی جامع مسجد کے سامنے بمبئی ستارہ ہوٹل میں قیام کیا۔ ساڑھے تین بجے سکندرہ گئے۔ رات کو تاج محل دیکھا۔ دوسرے دن فتح پور سیکری گئے اور رات کو ۱۲ بجے کے قریب واپس علی گڑھ کو روانہ ہوئے اور فجر میں پہنچ گئے۔

۱۹۳۶ء کے شروع ہوتے ہی کئی واقعات رونما ہوئے۔ بھائی غلام علی خان کے والد صاحب متھرا سے حلوے مٹھائیاں لاتے رہتے تھے۔ بھائی موصوف مجھے ضرور کھلاتے تھے لیکن سب لوگوں کو کیونکر کھلا سکتے تھے؟ احباب بار بار کھانے کا تقاضا کرتے رہے۔ لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ ان احباب نے اندازہ کیا کہ غلام علی خان میرا (راقم الحروف کا) بہت ادب کرتے ہیں تو اس ادب کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایک دن غلام علی خان اپنے کمرہ کا دروازہ لگا کر کہیں جانا چاہتے تھے کہ یار لوگوں نے مجھے پکڑ کر برآمدے میں کھڑا کر دیا۔ غلام علی خان نے مجھے سلام کیا اور میرے ادب کی وجہ سے انھوں نے دروازے پر تالا نہیں لگایا۔ احباب یہی چاہتے تھے۔ غلام علی خان جونہی کہیں جانے کے لیے روانہ ہوئے کہ احباب نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر ان کا صندوق اٹھایا اور پیش امام صاحب (مزمل ہوسٹل والے) کے کمرے میں رکھ دیا۔ پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "خاں صاحب چلو مٹھائی کھائیں گے"۔ میں نے کہا کہ میں نہیں جاؤں گا اور چوری کی مٹھائی نہیں کھاؤں گا"۔ وہ لوگ مایوس ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ لیکن مغرب کے بعد پھر آئے اور کہنے لگے کہ "خان صاحب چلو مٹھائی انتظار کر رہی ہے"۔ ان کے اصرار پر مجھے جانا پڑا۔ پیش امام صاحب اپنے کمرے

میں موجود تھے۔ صندوق میں تالا لگا ہوا تھا۔ پیش امام صاحب کہنے لگے کہ میرے پاس رہتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ریتی نکال کر دی۔ تالا کاٹا گیا۔ مٹھائی نکالی گئی اور پیش امام صاحب نے طلبہ سے زیادہ ہی داد دی۔ خیر۔ وہ صندوق پھر میرے کمرے میں لایا گیا۔ میں بازار سے تالا خرید کر لایا اور صندوق میں تالا لگا کر (چابیوں سمیت) بھائی غلام علی خاں کے کمرے کے دروازے پر رکھ آیا۔ علی گڑھ کے طلبہ مٹھائی کی چوری محض تفریح کے لیے کیا کرتے تھے۔ لیکن کوئی دوسری چیز چھونا بھی حرام سمجھتے تھے۔ چنانچہ بھائی غلام علی خاں کے پیسے وغیرہ سب چیزیں بالکل محفوظ رہیں۔ یہ واقعہ بھائی موصوف نے نہ کبھی مجھ سے پوچھا اور نہ میں نے کبھی ان کو بتایا۔

اس سال کا دوسرا خاص واقعہ یہ تھا کہ ۲۲ر اپریل ۱۹۳۶ء کو سہسرام (بہار) کے ایک نوجوان سید شاہ سبحان احمد صاحب علی گڑھ سے گزر رہے تھے۔ وہ حج کے لیے پیدل جا رہے تھے۔ صرف رات کو سفر کرتے تھے اور ہر پانچ قدم کے بعد دو نفل پڑھتے تھے۔ بھائی عبدالحمید جالندھری کے ساتھ میں بھی ان سے ملنے چلا گیا۔ اس دن ان کی طبیعت ناساز تھی اور وہ دوا کے لیے کسی حکیم کے پاس جانے والے تھے۔ ہم لوگوں نے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ انہوں نے میری ڈائری پر علامہ اقبال" کا یہ مصرع لکھ دیا:۔ ع جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

وہ کئی سال میں یہاں تک پہنچے تھے۔ بتاتے تھے کہ میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا رات کا وقت تھا میرے مکان کے قریب سے ایک بڑھیا گزری اس نے کہا کہ بیٹا مجھے راستہ نظر نہیں آ رہا ہے میری رہنمائی کر دو۔ میں لالٹین لے کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ تو میرے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ دنیا کے سفر میں اس بڑھیا کو میری رہبری کی ضرورت ہے تو میرے آخرت کے سفر میں جس ہستی کی ضرورت ہے وہاں میں کیوں نہ جاؤں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبری حاصل کرنے کے لیے اسی وقت عزمِ سفر کر لیا۔ میرے عزیزوں کو معلوم ہوا تو وہ آئے اور کہا کہ تم کو بحری جہاز سے مدینہ منورہ بھیج دیں گے۔ لیکن میں بالکل ان کی بات کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور چلتا ہی رہا اور چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔

تیسرا واقعہ یہ تھا کہ مئی ۱۹۳۶ء میں وائس رائے Lord Willingdon علی گڑھ آ رہا تھا۔ اس کی حفاظت کے لیے بڑا اہتمام تھا۔ مجھے بھی یونی ورسٹی پولیس میں شامل کیا گیا۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نظام دکن ہماری یونی ورسٹی کے چانسلر تھے۔ وہ پہلے تشریف لائے۔ پھر میزبان کی حیثیت سے وائس رائے کو لینے کے لیے اسٹیشن گئے۔ لال ڈگی کی طرف سے (۱) جو پہلا دروازہ

(۱) لال ڈگی کے نام سے وہاں کے دو دوستوں کی دوستی یاد آئی۔ وہاں ولایت حسین صاحب (ہاکی کے کھلاڑی مسعود زیدی کے بزرگ) نے اپنی کوٹھی کا نام اپنے دوست کے نام پر حبیب اللہ منزل رکھا اور حبیب اللہ صاحب نے اپنی کوٹھی کا نام ولایت منزل رکھا تھا۔ اسے ہم لوگ England Manzil کہا کرتے تھے۔ وہیں بعد میں Pictures gallery تعمیر ہوئی تھی۔

یونی ورسٹی میں داخل ہونے کے لیے ہے وہاں میری ڈیوٹی تھی۔ میر عثمان علی خان جب اپنی کار میں وائس رائے کو لا رہے تھے تو میں نے اس دروازے پر کار کو روک دیا اور کہا کہ Pass, please? وائس رائے نے زور کا قہقہہ لگایا۔ پھر میں نے ان کو اندر آنے کی اجازت دی۔ اس مذاق سے یونی ورسٹی کے اربابِ حل و عقد بہت خوش ہوئے کیونکہ اس سے یونی ورسٹی کے حفاظتی انتظامات کی تعریف ہوئی اور مجھے ایک سرٹیفکٹ بھی دیا گیا۔

لیکن خوشیوں کے ساتھ اس سال ایک روح فرسا سانحہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ نیو سرکل میں ایک رات احباب نے سرسید کی فاتحہ کا انتظام کیا یعنی مٹھائی کھانے کی تقریب منعقد کی۔ رات بھیگ چکی تھی۔ احباب نے ارادہ کیا کہ اب بریلی لائن پر منظور گڑھی اسٹیشن تک چلیں وہاں آم کھائیں گے۔ مجھ سے بھی چلنے کو کہا۔ میں نے معذرت کر لی۔ بہرحال یہ لوگ ریل سے روانہ ہوئے۔ ۹۔ ۱۰ میل کا فاصلہ تھا۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ احباب کا مشورہ یہ ہوا کہ گرمی کا زمانہ ہے۔ پہلے وہاں کی نہر میں تیراکی کر لیں۔ بھوپال کے سلطان محمود بھی ساتھ تھے۔ بہت نیک، نمازی اور خوبصورت شخص تھے۔ انہوں نے بھی نہر میں غوطہ لگایا اتفاق سے وہیں ایک مگرمچھ بیٹھا تھا۔ اس نے ان کو پکڑ لیا۔ انہوں نے ہاتھ ہلا کر اپنی بے بسی کا اشارہ کیا۔ افسوس کہ پھر ان کا پتا نہ چلا۔ پوری یونی ورسٹی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب (وائس چانسلر) اور بہت سے اساتذہ اس نہر پر گئے۔ غوطہ خوروں کو پانی میں بھیجا۔ لیکن سب بے سود رہا۔ مرحوم کے والد حکیم سلطان محمود صاحب (۱) دوسرے دن بھوپال سے آ گئے۔ لیکن سوائے گریہ وزاری۔ کے کسی کو کیا حاصل ہو سکتا تھا!

ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

علی گڑھ میں میرا قیام طویل رہا۔ بھائی انتظام الدین (م ۱۸ر اگست ۱۹۹۶ء۔ اُجین) کی وجہ سے ان کی والدہ صاحبہ اور خالاؤں نے جس شفقت کا برتاؤ میرے ساتھ کیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ ہی ان کو دے سکتا ہے۔ میں تو دعا ہی کر سکتا ہوں۔ ان کی وجہ سے علی گڑھ میرے لیے دوسرا وطن بن گیا تھا۔ علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد اور پاکستان بننے سے پہلے بارہا ان کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ اور ان سب کی یاد آج بھی تازہ ہے۔

علی گڑھ کی زندگی میں اچھا برا جو کچھ کیا ہے اس کی مختصر داستان اوپر عرض کر دی گئی۔ اب تو بارگاہ الٰہی میں یہی دعا ہے کہ:

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین ○

(۱) یہ حکیم صاحب بعد میں کراچی آ گئے تھے اور وہاں برنس روڈ پر مطب کرتے تھے۔

علی گڑھ کے بعض احباب

ڈاکٹر اختر امام مرحوم:

علی گڑھ کے انٹرمیڈیٹ کالج میں چار جماعتیں تھیں۔ نویں ، دسویں ، گیارھویں اور بارھویں ان جماعتوں کے طلبہ کچھ تو شہر میں رہتے تھے جو Day - Scholar کہلائے جاتے تھے اور زیادہ تر طلبہ اس کالج کے آٹھ ہوسٹلوں میں رہتے تھے۔ یعنی منٹو سرکل ، چار ہوسٹلوں کا مجموعہ تھا اور نیو سرکل یا IRWIN Circle بھی چار ہوسٹلوں پر مشتمل تھا۔ اختر امام صاحب اور راقم الحروف موخرالذکر سرکل کے جبلی jubilee Hostel میں رہتے تھے۔ وہیں سے ۱۹۲۹ء میں ہم دونوں نے میٹرک پاس کیا۔ اختر امام صاحب بہت ذہین رہے ہیں اور اس زمانے میں بھی عربی خط (نسخ) اس قدر خوبصورت لکھتے تھے کہ بہترین خطاطوں کا خط معلوم ہوتا تھا۔ میٹرک میں ان کا اختیاری مضمون عربی تھا اور شعر و شاعری کا ذوق بھی بہت تھا۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کالج کے مشاعرے پورے ملک میں شہرت رکھتے تھے۔ اور شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جو وہاں کے مشاعروں میں شرکت نہ کرتا ہو۔

اختر امام صاحب کو شاعری کا بہت شوق تھا۔ لیکن خود شعر نہیں کہتے تھے۔ اشعار بہت یاد تھے اور سخن فہمی اور سخن سنجی میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ میں ان کے ساتھ یہ شرارت کرتا تھا کہ کوئی مہمل شعر لکھ کر ان کو دیتا تھا کہ ذرا اس شعر کا مطلب سمجھا دیں۔ وہ بیچارے دیر تک غور کرتے ، پھر کوئی نہ کوئی مطلب مجھے سمجھا دیتے اور میں دل ہی دل میں ہنستا رہتا۔ گیارھویں جماعت کے زمانے میں اختر امام صاحب نے اور میں نے مزمل ہوسٹل میں قیام کیا۔ انہیں الیکشن کی سوجھی اور کالج الیکشن میں لائبریرین کی جگہ کے لیے منتخب ہوگئے۔ یار لوگوں نے ان کے یہاں خوب کھایا اڑایا اور انہوں نے اس فضول دوستی میں ایک سال ضائع کر دیا۔ یعنی ۱۹۳۱ء میں وہ وہیں رہے اور میں بارھویں جماعت پاس کر کے یونیورسٹی چلا گیا۔ بڑا افسوس رہا کہ ایسے ذہین اور قابل ساتھی کا ساتھ چھوٹ گیا۔

اختر امام صاحب کو باغ بانی کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں کوئی ملازمت نہیں کروں گا۔ بلکہ باغات تیار کروں گا۔ لیکن انہوں نے ایم اے (عربی) پاس کرکے باہر سے ڈاکٹریٹ ڈگری لی اور سیلون میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق وراثت میں ملا تھا۔ حضرت امداد امام اثر مرحوم کے خاندان سے ہیں۔ معارف وغیرہ میں (اور علی گڑھ

میگزین میں بھی) ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ پھر جب وہ سیلون Peradeniya میں شعبۂ عربی کے صدر ہوئے تو مجھے خط لکھا کہ میں (دوسری) شادی یہاں کر رہا ہوں میں نے اس موقع پر یہ قطعۂ تاریخ لکھ کر بھیجا:

محب مکرم ، حبیب قدیم ۔۔۔ جو ہیں فخر احباب و فخر انام
بفضل خدا و بجاہ حبیب ۔۔۔ عروسی سے لنکا میں ہیں شاد کام
رہیں شاد و آباد و فرحت فزا ۔۔۔ عروس مبارک ہیں اختر امام
۶ ۶ ۳ ۱ ۵ ۷ ۲ ۹ ۱ ۰

افسوس کہ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں دل کا دورہ پڑنے سے کراچی میں انتقال ہوا۔

بدیع الدین محمود صاحب:

علی گڑھ کے انٹرمیڈیٹ کالج کی دسویں جماعت میں جبلی ہوسٹل میں میرا قیام تھا۔ اسی زمانے میں بدیع الدین محمود صاحب اور شیخ علی جواد صاحب جیسے غیر معمولی ذہانت کے طلبہ نویں جماعت میں تھے۔ یہ دونوں حضرات اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے بہت مشہور بلکہ محسود ہوئے۔ بدیع الدین محمود صاحب گو کہ نویں جماعت میں تھے لیکن انگریزی اخبار Statesman کی تقلید میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک انگریزی اخبار (کبھی کبھی) تیار کرتے تھے۔ اس میں کالج کے حالات اور ان پر سرخی بڑے بڑے حروف میں لکھتے تھے۔ بڑی شہرت ہوئی۔ علی گڑھ میگزین میں بھی مضامین (انگریزی میں) شائع کرتے تھے۔ اچھے برے لوگ ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ کسی نے حسد کی وجہ سے ان پر نیند کی حالت میں فنائل پھینک دیا جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں عرصے تک تکلیف رہی۔ بحمداللہ وہ پھر بالکل اچھے ہوگئے اور برابر تحریر و تقریر میں معروف رہے۔ اب ماشاء اللہ وہ سیلون میں وزیر ہیں۔ ان کے ساتھی شیخ علی جواد صاحب بھی بلا کے ذہین رہے ہیں۔ انہوں نے میٹرک کے زمانے میں جب ریاضی کا پرچہ حل کیا تو پرچے میں سرخی یہ تھی کہ: Solve any six (or seven) questions پرچے میں غالباً ۱۰ - ۱۱ سوالات تھے۔ شیخ علی جواد صاحب نے سب سوالات حل کیے اور اپنی کاپی پر یہ سرخی لکھ دی:

Evaluate any six (or seven) answers.

یعنی ان کو اپنے جوابوں پر اس قدر اعتماد تھا۔

پاکستان بننے پر وہ کراچی آگئے اور جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ بھی محسود ہیں۔ مجھے کراچی سے یاد کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرح نوازے۔ آمین۔ ثم آمین۔

چودھری عبدالحمید صاحب جالندھری:

علی گڑھ میں انہوں نے ایم اے (فلسفہ) پاس کرنے کے بعد ایم اے (فارسی) میں داخلہ لیا تو اس وقت شناسائی ہوئی اور یہ شناسائی بحمداللہ ایسی بڑھی کہ ان سے اور ان کے خاندان والوں سے ہم سب کی محبت حقیقی بھائی اور حقیقی عزیزوں جیسی ہے۔ میں کیا لکھوں کہ میں نے ان سے کیا کیا سیکھا اور بالواسطہ میری تربیت کس طرح ہوئی۔ علامہ اقبال سے شغف انہی کی وجہ سے پیدا ہوا اور دینی معاملات میں بھی مجھے ان سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ ان کے بچے میرے بچے ہیں اور میرے بچے ان کے بچے ہیں۔ میں پاکستان پہنچنے سے پہلے جالندھر ان سے ملنے جاتا تھا اور وہ جب کابل کے دارالمعلمین میں پروفیسر تھے تو وہاں سے محض میری ملاقات کے لیے امراؤتی تشریف لائے تھے جب کہ میں وہاں کنگ ایڈورڈ کالج میں استاد تھا۔ ہوائی حادثے میں ان کے صاحبزادے فلائیٹ لفٹیننٹ عبدالحسیب شہید ہوئے تو ان پر جو گزری وہ تو فطری چیز ہے لیکن ہم لوگوں پر جو گزری وہ بیان سے باہر ہے۔ چودھری صاحب کے متعلق عرصہ ہوا کتاب سراج البیان میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی ان کے ساتھ رکھے۔ آمین۔ ثم آمین۔

غلام علی خان مرحوم (متھراوی):

غلام علی خان صاحب متھرا کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ میں وہ دو سال مجھ سے پیچھے تھے۔ سائنس میں اور بالخصوص ریاضی میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں سب سے اول رہے۔ ہمت اور حوصلے میں بھی ان جیسے لوگ بہت کم ہوں گے۔ علی گڑھ کی زندگی میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے اور مشکلات میں ہم ایک دوسرے کے ہمدرد تھے۔ ہنوٹ اور کشتی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ادبی ذوق بھی اچھا تھا۔ ہنسی مذاق کی زندگی کو علی گڑھ کے ماحول نے اور بھی شوخ بنا دیا تھا۔ لیکن وہ میرا ادب بھی کرتے تھے۔

علی گڑھ میں ان کے والد مرحوم تشریف لائے تو بہت سی مٹھائیاں بھی لاتے تھے۔ غلام علی خان مجھ کو تو کھلا دیتے تھے لیکن سب کو تو نہیں کھلا سکتے تھے۔ میرے بعض احباب نے ایک ترکیب سوچی کہ جب وہ اپنے کمرے سے نکلنے لگے تو ان لوگوں نے دھکیل کر مجھے برآمدے میں کھڑا کر دیا۔ اس خیال سے کہ غلام علی خان مجھے دیکھیں گے تو ادب کی وجہ سے اپنے کمرے میں تالا نہیں لگائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ غلام علی خان نے مجھے کھڑا دیکھا تو بغیر تالا لگائے ہوئے اپنے کام سے چلے گئے۔ یار لوگ یہی تو چاہتے تھے۔ بس ان کے کمرے میں گھس کر ان کا صندوق اٹھایا

اور ہوسٹل کی مسجد کے پیش امام صاحب کے کمرے میں رکھ آئے۔ پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ خان صاحب چلو، اب غلام علی خان کے صندوق سے مٹھائی نکالیں۔ میں نے کہا کہ میں چوری کی مٹھائی نہیں کھاؤں گا۔ کہنے لگے کہ ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ میں نے کہا کہ اچھا ہے۔ تم لوگ بھی مت کھاؤ۔ وہ لوگ چلے گئے۔ پھر تھوڑی دیر میں واپس آئے اور چوری کی مٹھائی کے فوائد بیان کرنے لگے کہ اس کے کھانے سے خون زیادہ بنتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم اپنا خون زیادہ بناؤ۔ میں نہیں بناؤں گا۔ وہ لوگ پھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ دل آزردہ ہیں، میں ہی ان کے پاس چلا چلوں۔ چنانچہ میں جب ان کے پاس پہنچا تو خوشی کے مارے وہ لوگ اچھل پڑے۔ آخر ہم لوگ ہوسٹل والے امام صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ صندوق میں تالا لگا ہوا تھا تو امام صاحب فرمانے لگے کہ میرے پاس ریتی ہے۔ انہوں نے ریتی عنایت فرمائی۔ تالا کاٹا گیا اور صندوق سے مٹھائی نکالی گئی۔ سب نے کھائی۔ پیش امام صاحب نے بھی بڑھ بڑھ کر داد دی۔ پھر نیا تالا لایا گیا اور چابیوں سمیت غلام علی خان کا صندوق ان کے کمرے کے دروازے پر رکھ دیا گیا۔ علی گڑھ کی شرافت اور وہاں کی امتیازی شان یہ تھی کہ مٹھائی کو تو اپنے لیے حلال سمجھتے تھے لیکن کسی کی کسی اور چیز کو چھونا بھی حرام سمجھتے تھے۔

غلام علی خان سے علی گڑھ کو خیرباد کہنے کے بعد بھی برابر خط و کتابت ہوتی رہی۔ وہ ریاضی کے پروفیسر بھی ہو گئے تھے۔ بعد میں کراچی آ گئے اور حبیب بینک میں اپنی غیر معمولی قابلیت اور ذہانت سے ایسی ترقی کی کہ تمام لوگ ان کے احسان مند ہوئے اور آج تک ان کے بنائے ہوئے اصولوں اور قواعد پر تمام بینکوں والے عمل پیرا ہیں۔ ان کے مجھ پر بھی بہت سے احسانات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے بچوں کو بیش از بیش فلاح دارین سے نوازے۔ آمین۔ ثم آمین۔ غالب کا یہ شعر مرحوم کے ذکر میں بہت یاد آتا ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

غلام احمد خان مدنی مرحوم:

آپ نواب محمد اسمٰعیل خان مرحوم کے صاحبزادے اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے پرپوتے تھے۔ میرٹھ میں آپ نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانوں میں اول مقام حاصل کیا۔ ۱۹۳۱ء میں علی گڑھ آ کر بی اے میں داخلہ لیا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا اور ایک اور غلام احمد

خان بھی ساتھ تھے جو حیدرآباد دکن کے تھے۔ چنانچہ ناموں میں التباس سے بچنے کے لیے ہمارے غلام احمد خان نے مدنی لفظ شامل کرلیا۔ ان کے دو بھائی اکرام صاحب اور عدنی صاحب بھی اس زمانے میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ مدنی صاحب عثمانیہ ہوسٹل میں رہتے تھے اور ان کے کرے سے نوابی شان ظاہر ہوتی تھی لیکن انہوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی اعلیٰ شرافت مثالی سمجھی جاتی تھی۔

مدنی صاحب نے ہم لوگوں کے ساتھ بی اے کا امتحان دیا۔ میرا رول نمبر ۱۴ تھا۔ اور ان کا رول نمبر ۱۳ تھا۔ مدنی صاحب اس امتحان میں بھی ۱۹۳۳ء میں سب سے اول آئے۔ پھر ایم اے (فارسی) میں ہم دونوں نے داخلہ لیا۔ لیکن اسی زمانے میں انہوں نے انڈین پبلک سروس کمیشن کے امتحان کی تیاری شروع کر دی اور ماشاء اللہ اس امتحان میں بھی وہ پورے ہندوستان میں دوم قرار دیے گئے۔ مجھے اخبار سے معلوم ہوا تو میں مبارکباد کا خط (میرٹھ کے پتے پر) ڈالنے کے لیے اسٹیشن گیا۔ اور عجلت پسندی کی وجہ سے اپنی سائیکل باہر ہی چھوڑ دی اور اس طرح وہ غائب ہونے والی ہی تھی۔

طالب علمی کے زمانے کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ پروفیسر منظور حسین شور صاحب ہم لوگوں سے ایک سال آگے تھے۔ انہوں نے ایم اے (فارسی) کے فائنل کا امتحان دیا تو ایم اے کا پرچہ حل کرنے کے بجائے بی اے کا (فارسی کا) پرچہ حل کر دیا، کیونکہ دونوں پرچے ایک ہی وقت میں اسٹریچی ہال میں ہو رہے تھے۔ پرچہ کرکے جب شور صاحب باہر نکلے تو مدنی صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ پرچہ کیسا ہوا؟ انہوں نے فرمایا کہ بہت اچھا ہوا۔ مدنی صاحب نے کہا کہ میں بھی آپ کا پرچہ دیکھوں۔ پرچہ دیکھا تو وہ بی اے کا تھا۔ اب کیا تھا! سخت پریشانی ہوئی۔ مدنی صاحب فوراً نواب صاحب کے پاس گئے اور واقعہ بتایا۔ نواب صاحب تشریف لائے اور شور صاحب کو اسٹریچی ہال میں بٹھا کر ایم اے کا پرچہ دلوایا۔ خوب تسلی دی اور پہلے کھانا کھلایا بعد میں پرچہ حل کرایا۔

پاکستان بننے پر وہ کراچی اور پشاور وغیرہ میں کمشنر رہے اور دوسرے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ایک مرتبہ وہ امریکہ سے واپسی پر حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اس سال میں بھی حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ مدینہ منورہ اور منیٰ میں ان سے ملاقاتیں رہیں۔

آخر میں وہ سندھ اسمبلی میں رکن منتخب ہوئے تھے۔ پھر یکایک دل کے عارضے سے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اللہ بخشے عجیب شرافت کا مجسمہ تھے۔

نامدار خان مرحوم:

ان کا تعلق گوندیا اور ناگ پور سے تھا۔ علی گڑھ میں وہ مجھ سے دو سال آگے تھے لیکن بہت تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ریاضی میں ایم اے (درجہ دوم) پاس کیا لیکن اپنی بہن کی تعلیم کی وجہ سے علی گڑھ میں اپنے قیام کو طویل بنایا۔ یعنی ۱۹۳۳ء میں ایل ایل بی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ میں اکثر ان کے ساتھ کلاس میں سب سے اگلی بینچ پر بیٹھا کرتا تھا۔ ہنسی مذاق تو علی گڑھ کے طلبہ کی فطرت میں خصوصی طور پر داخل ہے۔ کلاس میں بھی تفریح رہا کرتی تھی۔ ایک دن مجھے دیر ہوگئی تو مجھے کلاس میں پیچھے کی بینچ میں جگہ ملی۔ تفریح یہ رہی کہ ایک ہندو طالب علم جو فیلٹ کیپ پہنتا تھا (ہندو طلبہ کو ترکی ٹوپی کے بجائے ایسی ٹوپی کی اجازت تھی) وہ اپنی ٹوپی ڈیسک پر رکھ کر اپنی تعلیم میں مصروف تھا۔ نامدار خان صاحب نے خاموشی سے وہ ٹوپی اٹھائی اور پیچھے کی سیٹ پر رکھ دی۔ وہاں سے وہ ٹوپی کئی منزلیں طے کرتی ہوئی میری ڈیسک پر پہنچی۔ میں اسے لے کر باہر آگیا۔ احباب نے جو وہ ٹوپی میرے ہاتھ میں دیکھی تو اس کو فٹبال بنا لیا۔ اور وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ دوسرے دن میں ان ٹکڑوں کو لے کر کلاس میں پہنچا اور ایک پرچہ اس مضمون کا لکھا کہ "پنڈت جی، مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے دوستوں نے آپ کی ٹوپی کی فٹ بال کھیل ڈالی۔ اب جو کچھ بچ رہی ہے وہ آپ کی خدمت میں واپس کی جارہی ہے"۔ میں نے نامدار خان سے کہا کہ ٹوپی کے یہ ٹکڑے میرے پرچے کے ساتھ کسی صورت سے استاد کی میز پر رکھ دو۔ انہوں نے کہا کہ بالکل ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ استاد صاحب کی نظر بچا کر نامدار خان نے وہ ٹکڑے اور میرا پرچہ ان کی میز پر رکھ دیا۔ وہ استاد بیرسٹر خسرو اسحٰق صاحب تھے جو بہت اونچا سنتے تھے (ایک استاد بیرسٹر خواجہ اسحٰق صاحب بھی تھے جو بلی موریا کے لقب سے مشہور تھے)۔ استاد (بیرسٹر خسرو اسحٰق) صاحب نے جب وہ پرچہ دیکھا تو اسے پڑھ کر سنایا اور دریافت کیا کہ یہ پھٹی ہوئی ٹوپی کس کی ہے؟ پنڈت جی کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ وہ ٹوپی میری ہے۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ کلاس کے بعد آئیے۔ کلاس ختم ہوئی تو پنڈت جی آئے اور دوسرے لڑکے بھی جمع ہوگئے۔ استاد صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کو کیا شکایت ہے؟ پنڈت جی نے کہا کہ میں وائس چانسلر کو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ استاد صاحب اونچا سنتے تھے اس لیے ان کی بات سنائی نہ دی۔ ایک طالب علم سے پوچھا کہ پنڈت جی کیا فرماتے ہیں؟ طالب علم نے کہا کہ پنڈت جی فرماتے ہیں، میری ٹوپی ایک روپے کی تھی۔ ایک روپیہ دلوا دیجیے۔ پنڈت جی ناراض ہو کر فرمانے لگے کہ میں نے ایسا نہیں کہا، میں تو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب نے نہیں سنا تو پھر طالب علم سے

دریافت کیا کہ پنڈت جی کیا فرما رہے ہیں؟ طالب علم نے کہا کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روپیہ نہیں ، تو اٹھنی دلوا دیجیے ۔ (لڑکوں کا ہنستے ہنستے برا حال تھا) پنڈت جی چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ، میں تو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں ، بیرسٹر صاحب پھر نہ سن سکے ، اس لیے طالب علم سے پھر دریافت کیا کہ پنڈت جی کیا فرما رہے ہیں؟ طالب علم نے کہا کہ پنڈت جی فرماتے ہیں کہ اٹھنی نہیں ، تو چونی ہی دلوا دیجیے- بیرسٹر صاحب نے فرمایا کہ اچھا ، میں چونی آپ کو دیدوں گا- آخر پوری کلاس قہقہوں کے ساتھ ختم ہوئی اور یہ واقعہ عرصے تک یادگار بنا رہا-

علی گڑھ میں نامدار خان Semi - boarder کی حیثیت سے رہتے تھے اور تنگی کے باوجود ہشاش بشاش رہا کرتے تھے- وہاں سے فارغ ہو کر گوندیا (سی-پی) میں وکالت کرتے رہے- میں بارہا ان سے ملنے کے لیے گیا ہوں- پاکستان پہنچنے پر وہ حیدرآباد آگئے اور یہاں بھی گوندیا کی طرح ایک مشہور اور اعلیٰ درجے کے وکیل ثابت ہوئے- وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے بچوں کو کیا معلوم کہ ہماری زندگی کس طرح گزری-

وہ بیرسٹر صاحب جن کا ذکر اوپر آیا ہے ، نامدار خان صاحب کی ذہانت سے متاثر تھے- چنانچہ اپنی ایک عزیزہ کی شادی ان کے ساتھ کردی- ان کا تعلق مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی سے بھی تھا- محترمہ کو سرطان ہوگیا تھا ، افسوس کہ وہ اس مرض میں فوت ہوئیں- چند سال کے بعد ۱۹۷۷ء میں نامدار خان بھی اللہ کو پیارے ہوئے- مرحوم کے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کرتا رہتا ہوں- میں نے ان کے انتقال پر قطعہ تاریخ بھی لکھا تھا- ان کے ایک صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں- دونوں بہت ذہین اور بہت سعادت مند ہیں- اللہ ان کو خوش رکھے- آمین-

سراج الحسن کاظمی مرحوم:

کاظمی صاحب علی گڑھ کے رہنے والے اور علی گڑھ کے احباب میں سے خصوصی محبت والے تھے- علی گڑھ کی ہاکی ٹیم میں تھے اور میرے ہم جماعت اور ہم کمرہ محترم سید محمد صاحب کے ساتھ کھیلا کرتے تھے- ماشاء اللہ سید محمد صاحب پولس کے بڑے سے بڑے عہدے پر فائز اب فارغ ہیں اور اسلام آباد میں قیام پذیر ہیں- آپ پروفیسر وقار عظیم صاحب مرحوم کے ہم زلف ہیں- کاظمی صاحب نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا- پاکستان پہنچنے پر وہ کراچی آگئے - وہاں میری پہلی ملاقات بندر روڈ پر آدم مسجد کے قریب ہوئی- پھر وہ حیدرآباد آگئے اور تلک چاڑی میں قیام کیا- میں بھی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد آگیا- تو ان سے تعلقات زیادہ بڑھے- گھر والوں کا آنا جانا ہوتا رہا- پھر وہ کراچی چلے گئے- لیکن مجھ سے بدستور محبت اور خلوص رکھتے رہے اور میری طبیعت کی ناسازی سنتے تھے تو بے چین ہو جاتے تھے- ان کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادے (بالخصوص میجر احسن میاں) ہمیشہ کرم فرماتے ہیں اور میرے بیٹے سراج احمد خان سلمہ کے پاس برابر تشریف لاتے ہیں- افسوس کہ کاظمی صاحب ۱۹ دسمبر ۱۹۸۸ء کو وفات پاگئے- اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت کی راحتیں عطا فرمائے- آمین - ثم آمین-

مرحوم اپنے اسلاف کرام کے متعلق حالات جمع کر رہے تھے اور مجھ سے بھی مشورہ لیتے رہتے تھے- خدا کرے کہ وہ کتاب شائع ہو جائے اور میرے ایک عزیز دوست کی یادگار بن جائے-

محمد امین کھوسو مرحوم:

علی گڑھ کے احباب میں یہ بھی خصوصیت رکھتے تھے- تقریر کرنے کا بہت شوق تھا- یونین ہال میں موقع ہو یا نہ ہو ضرور کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ نہ کچھ فرما دیتے تھے- اس زمانے میں بھی تھوڑی سی اور چھوٹی سی ڈاڑھی تھی- بعد میں بڑی ہوگئی اور وہ قد و قامت میں بھی اور ہر لحاظ سے بڑے ہوگئے یعنی بالکل پیروں جیسا لباس اور صحیح مسلمانوں جیسی خصوصیات حاصل کیں-

انہیں جب معلوم ہوا کہ میں پاکستان آگیا ہوں تو انتہائی خلوص کے ساتھ مجھے خط لکھا کہ "تم میرے پاس آجاؤ اور میرے پاس رہو- تم کو کسی ملازمت کے کرنے کی مطلق ضرورت نہیں"۔

ان سے کوئٹہ اور مختلف مقامات میں ملاقات ہوتی رہتی تھی- دیکھتے ہی دوڑ کر گلے ملتے تھے اور دعاء کرتے تھے- اللہ پاک ان کو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے- آمین - ثم آمین-

شیخ غلام حسن مرحوم:

سندھ کے احباب میں یہ بھی بڑی خصوصیت رکھتے تھے- علی گڑھ میں ایل ایل بی تک کے درجات میں ساتھ رہا- بی اے کے زمانے میں فارسی کے نصاب کی مشکلات مجھ سے حل کراتے تھے- اسی لیے وہ اکثر مجھے اپنا استاد کہا کرتے تھے- علی گڑھ سے فراغت کے بعد خط و کتابت ہوتی رہتی تھی- پاکستان آنے پر انہوں نے مجھے مبارکباد دی- سکھر میں سیشن جج تھے- ایم اے کا زبانی امتحان

لینے کے لیے جب میں وہاں گیا تو انہوں نے دو وقت میری دعوت کی۔ حیدرآباد تشریف لاتے تو میرے مکان پر بھی تشریف لاتے۔ لطیف آباد میں قیام تھا۔ وہاں سے بھی مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ میں بھی حاضر ہوتا تھا۔ ان کی ایک صاحبزادی ، سندھ یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ وہ بھی بہت خلوص کے ساتھ مجھ سے ملتی ہیں۔ اللہ پاک شیخ صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے عزیزوں کو فلاح دارین سے خوب نوازے۔ آمین - ثم آمین۔

ایک اور خاص دوست (۲)

علی گڑھ کے احباب میں ان صاحب کا خلوص بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ عمر میں تو مجھ سے کچھ بڑے ہیں لیکن میٹرک سے ایم اے تک ساتھ تھے اور شاید ہی کوئی دن ایسا ہوگا جب کہ کلاس کے باہر بھی ان سے بے تکلفی کی باتیں نہ ہوتی ہوں۔ ان سے تعلقات کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ ان کے خاندان کے چھوٹے بڑے اکثر افراد ابھی تک میرے کرم فرما ہیں اور میں علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد بہت مرتبہ صرف ان سے ملنے کے لیے علی گڑھ گیا ہوں۔ وہ اب بھی ہندوستان میں ہیں۔ ان کی بعض خصوصیات ہیں : میرے ساتھ چلتے تو مجھے مخاطب کرنے کے لیے بار بار بہت زور سے اپنی کہنی میرے بازو پر مارتے۔ میں بچنا چاہتا اور الگ ہو کر چلنا چاہتا تو پھر قریب آجاتے اور پھر کہنی کی ضرب رسید کرتے۔ اور دنیا بھر کی بے کار باتیں سناتے۔ کبھی کبھی ایسی بے پر کی اڑاتے کہ میرے احباب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ڈاکٹر نے میرے ایک کان میں دوا ڈالی تو وہ دوا دوسرے کان سے نکلی۔ ابھی چند سال پہلے انہوں نے اسی طرح کی خصوصی اطلاع بھجوائی کہ ڈاکٹر میری آنکھ کا آپریشن کر رہا تھا تو خراب آنکھ کے بجائے اچھی آنکھ کا آپریشن کر دیا۔ پھر ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جس محفل میں ہوتے تو پھر کسی اور کو بات کرنے کا موقع نصیب نہ ہوتا۔ غالباً اسی وجہ سے ان کی پہلی بیوی نے ان سے جان چھڑائی۔ اب دوسری بیوی بھگت رہی ہے۔

بی اے میں تھے تو میری کتابیں بھی دوسروں کو دے آتے تھے اور مجھے بھی پڑھنے سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ بی اے کے زمانے میں فرمانے لگے کہ خاں صاحب ، میں امتحان میں نہیں بیٹھوں گا۔ میں نے پوچھا ، کیوں ؟ فرمانے لگے کہ کچھ پڑھا نہیں ، اور انگریزی تو بالکل نہیں پڑھی۔ میں نے کہا کہ میں انگریزی پڑھا دوں گا۔ چنانچہ میں ہر روز مغرب کے بعد اور کبھی دن میں ان کے گھر جاکر انگریزی پڑھاتا تھا۔ شکر ہے کہ وہ پاس بھی ہوگئے اور چند ماہ کے لیے ان کی سستی دور ہوگئی۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ بس امسال ، میں ہوسٹل میں رہوں گا۔ چنانچہ انہوں نے گھر کو

خیرباد کہا اور ایک ہوسٹل میں براجمان ہوگئے۔ وہ ہوسٹل میرے ہوسٹل سے ملحق تھا۔ اس لیے اکثر میرے پاس آجاتے اور آتے ہی میرے بستر پر دراز ہو جاتے اور حسب معمول ، باتوں کا دریا بہا دیتے۔ کئی کئی دن وہ میرے کمرے میں رہتے۔ میں یونیورسٹی جاتا تو بعض احباب کو باری باری سے ان کے پاس ان کی باتیں سننے کے لیے متعین کر جاتا۔

ان کے جوتے اور موزے جس دن سے ان کے قبضے میں آتے اپنے آخری دم تک ہر طرح کی صفائی سے بے نیاز ہو جاتے۔ غرض کہ سستی اور کاہلی میں ، نیز باتوں کی جھونگانے میں ان کا کوئی جواب نظر نہیں آیا۔ پاکستان پہنچنے کے بعد یعنی ۴۱ - ۴۲ سال میں ان کا صرف ایک خط آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت باخطرات رکھے۔ آمین۔ ثم آمین۔

سید محمد صاحب مرادآبادی:

میرے بڑے عزیز دوست ہیں۔ علی گڑھ میں ایک ہی کلاس میں رہے ہیں اور عرصے تک ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ بڑی محبت اور خلوص والے ہیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم صاحب مرحوم کے ہم زلف ہیں۔ نماز اور روزہ کے سخت پابند - فارسی کے بڑے دلدادہ - بہت باحیا اور باوقار رہے ہیں۔ بی اے کے زمانے میں ان کی منگنی ہوئی۔ لیکن حیا کی وجہ سے مجھ پر ظاہر نہیں کی۔ ان کی بیگم کے بھائی صاحبان بھی بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ان کے خاندان پاکستان میں مقیم ہیں۔

علی گڑھ میں سید صاحب کی رساول خاص چیز تھی۔ مرادآباد سے ایک گھڑا بھر کر لایا کرتے تھے اور کئی کئی دن تک احباب کی ضیافت ہوتی رہتی تھی۔ ہاکی بہت اچھی کھیلا کرتے تھے۔ بعد میں پولس میں انسپکٹر ہوگئے تھے۔ بریلی میں تھے تو میں ان سے وہاں ملنے بھی گیا تھا۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ٹریفک پولس کے سب سے بڑے افسر ہوئے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی ٹریننگ حاصل کی۔ حج بھی کیا۔ آج کل مستقل قیام اسلام آباد میں ہے۔ اب تک ماشاء اللہ کئی میل دوڑ لگاتے ہیں اور ان کی صحت باعث رشک ہے۔ ان سے چھوٹے بھائی سید مصطفیٰ صاحب ہندوستان میں فوج کے (غالباً) بریگیڈیئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی سید حامد صاحب کمشنر تھے ، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ یہ دونوں بھائی ہندوستان میں ہیں اور وہ بھی مجھ سے بہت خلوص رکھتے ہیں۔

سید صاحب کی بیگم صاحبہ (سابدہ بھابی) بہت زندہ دل ہیں۔ میں ۱۹۸۷ء میں اسلام آباد گیا تو ان سے بھی ملا۔ فرمانے لگیں کہ "ڈاکٹر صاحب، آپ نے میری شادی کیسے شخص سے کرائی ہے! یہ تو عجیب آدمی ہیں"۔ ان کا یہ جملہ اکثر یاد آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو دونوں جہانوں میں سرفرازی عطا فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

میرے زمانے میں یونی ورسٹی کے چانسلر یہ حضرات تھے :-

سلطان جہاں بیگم (والیٔہ بھوپال) یکم دسمبر ۱۹۲۰ء سے ۱۴ مئی ۱۹۳۰ء تک رہیں۔ انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے ایک شاندار عمارت بھی بنوائی تھی جو انھی کے نام سے منسوب ہوئی۔ اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب حمید اللہ خان (والیٔ بھوپال) ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء سے ۷۔ اپریل ۱۹۳۵ء تک چانسلر رہے۔ پھر میر عثمان علی خان (نظامِ حیدر آباد۔ دکن) ۲۶ اگست ۱۹۳۵ء سے ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء تک چانسلر رہے۔

اور وائس چانسلر یہ حضرات تھے :-

نواب سر محمد مزمل اللہ خان (بھیکم پور)۔ یکم جنوری ۱۹۲۷ء سے ۸ فروری ۱۹۲۹ء تک رہے۔ پہلے بھی وہ دو مرتبہ قائم مقام وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ اُن کے بعد سر شاہ محمد سلیمان ۹ فروری ۱۹۲۹ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء تک وائس چانسلر رہے۔ پھر سر سید کے پوتے سر راس مسعود ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء سے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ پھر سر شاہ محمد سلیمان دوبارہ یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء سے ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۵ء وائس چانسلر ہوئے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر سر ضیاء الدین ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء سے ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء تک رہے ....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

میرا جبل پور

جبل پور (ممالک متوسط یعنی سی پی میں) عرض البلد ۲۳۔ طول البلد ۸۰ میں واقع ہے۔ جبل پور کے مغرب کی طرف ہوا باغ۔ برگی اور مُنکری (غالباً نبیذ کی وجہ سے) وغیرہ ایسے مقامات ہیں جن کے نام مسلمانوں ہی نے رکھے ہوں گے۔ ریلوے کی چھوٹی لائن ان مقامات سے ہوتی ہوئی بالا گھاٹ پھر گوندیا جاتی ہے اور وہاں سے دوسری لائن ناگ پور جاتی ہے۔ ریلوے کی بڑی لائن جو الٰہ آباد، مانک پور، ستنا، امدرہ، کٹنی، سیہورہ، پناگر سے ہوتی ہوئی جبل پور آتی ہے وہ بھی مغرب کی طرف بھیڑا گھاٹ، اٹارسی، کھنڈوا، برہان پور اور بھساول سے ہوتی ہوئی بمبئی کو جاتی ہے۔ جبل پور سے مرزا پور روڈ جو شمال میں پناگر، سیہورہ، کٹنی ہوتی ہوئی بنارس کی طرف جاتی ہے پورے راستے میں (سڑک کی دونوں طرف) آموں کے اونچے اونچے درختوں سے سجی ہوئی ہے اور جگہ جگہ باؤلیاں بنی ہوئی ہیں جن کے پہلے حصے میں مسافروں کے آرام کے لیے پختہ صحن ہیں۔ یہی مرزا پور روڈ جب جبل پور کے شہر میں (جنوب کی طرف) داخل ہوتی ہے تو گوہل پور، ملونی گنج، (اور ملونی گنج سے مغرب کی طرف پاٹن وغیرہ)، تمرہائی، لارڈ گنج، کوتوالی، کمانیہ دروازہ، فوارہ (اور فوارہ سے کئی اطراف) اور آگے مڑھا تال (انجمن اسلامیہ ہائی اسکول) جہانگیر آباد اور اس سے آگے ہوا باغ تک جاتی ہے۔

جبل پور کے جنوب میں ۱۰ میل پر منڈلہ ہے جو گونڈ راجاؤں کے قبضے میں تھا اور اس سے چند میل پر امر کنٹیک پہاڑ ہے جہاں سے نربدا ندی نکلتی ہے۔

جبل پور میں ۷۰۔ ۸۰ انچ بارش ہوتی ہے۔ اس لیے گھنے جنگل، سرسبز پہاڑ، اور ان میں چرندے، پرندے، درندے بہت ہیں۔ جگہ جگہ چشمے، تالاب، چھوٹی چھوٹی ندیاں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شہر میں بہت سے تالاب خشک کیے گئے اور وہاں آبادیاں قائم ہوئیں۔ پھوٹا تال، الف خاں کی تلیا جوڑی تلیا بھان تلیا وغیرہ اسی طرح کے محلے ہیں۔ جنگل اور پہاڑ مختلف قدرتی پھلوں اور ادویہ سے بھرپور ہیں۔ تیندو، کسیرو، کونچ، گھونگھچی کی بیلیں اور رنگارنگ سبزیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ کھیر درخت سے کتھا تیار ہوتا ہے۔ شریفے (جن کو وہاں سیتا پھل کہتے ہیں) عموماً خودرو ہیں اور بعض علاقوں میں اس قدر اعلیٰ قسم کے ہوتے ہیں (جیسے رانی تال، گڑھا، مدن محل، وغیرہ میں) کہ کسی اور مقام پر نہیں دیکھے۔ تیندو بالکل املوک پھل کی طرح ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں بڑی گٹھلی ہوتی ہے۔ وہ ہرن کو بہت مرغوب ہے اور اسی درخت کے پتے، بیڑی بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ غریبوں کا عموماً یہی پیشہ (بیڑی بنانے کا) ہے۔ شہر کے مشرق میں Gun Carriage Factory ہے۔

جہاں ہزاروں لوگ ملازم ہیں۔ سرکاری ملازمتیں مختلف اقسام کی ہیں۔ محلہ مدار ٹیکری میں جولاہے اور قصاب زیادہ ہیں۔ دوسرے پیشے بھی حسب ضرورت ہیں اور روزی دینے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ راقم الحروف کے زمانے میں شہر میں اردو پرائمری اسکول صرف تین تھے۔ صدر میں بھی ایک اسکول تھا۔ ہندی اسکول بھی زیادہ نہیں تھے۔ ہائی اسکول ۵-۶ تھے اور کالج صرف ایک تھا (رابرٹسن کالج)۔ لیکن اب وہاں یونیورسٹی بھی ہے اور ہائی کورٹ بھی۔ ہندوؤں کی کثرت تھی۔ اس لئے مندر بھی بہت تھے۔ بھان تلیا اور ملونی گنج محلوں کے درمیان ایک تالاب (ہنومان تالاب کے نام سے مشہور ہے)۔ اس میں سڑا ہوا پانی جمع ہوتا ہے۔ بہت وسیع ہے اور اس کے جنوبی مغربی کونے میں گوبند داس کے محل کا کچھ حصہ پانی میں ہے۔ اسی کے قریب اس کے باپ گوکل داس کا بہت بڑا محل ہے۔ اس نے رفاہی کام بہت کیے تھے اور ریلوے اسٹیشن کے قریب کئی وسیع عمارتیں بنوا کر عدالتوں کے لیے وقف کر دی تھیں۔ اسی لیے انگریزوں نے اسے راجہ کا خطاب دیا تھا۔ شہر کے مشرقی حصے میں اس نے اپنے بیٹے کے نام پر بہت شاندار اور وسیع محل گوبند بھون کے نام سے تیار کیا تھا اور ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک سرائے بھی تعمیر کی تھی۔ راجہ گوکل داس، ہر مذہب کے لوگوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ غریبوں کو مفت دوائیں بھی تقسیم کرتا تھا لیکن اس کا بیٹا مسلمانوں سے دشمنی رکھتا تھا اور کانگریس کا بڑا کارکن تھا۔ جین مذہب والوں کے بھی بکثرت مندر تھے جو اکثر مقفل رہتے تھے۔ ہندوؤں کے ہر فرقے کے مردے جلائے جاتے تھے۔ بعض کی لاشیں زمین پر یا پہاڑ کی کسی چوٹی پر رکھ دی جاتی تھیں جن کو چیل کوے کھاتے رہتے تھے۔

جبل پور اور اس کے گردونواح میں ایک سفید مٹی ہوتی تھی جس کو چھوئی کہتے تھے۔ لوگ اسے بھگو کر اپنے مکانات پوتتے تھے زرد. سرخ. سبز اور سیاہ مٹی بھی ہوتی تھی اور ریت ملی ہوئی مٹی Moraine بہت مضبوط ہوتی تھی۔ کچے مکانات عموماً اسی مٹی سے بنائے جاتے تھے جو اینٹ کے مکانوں سے زیادہ پختہ ہوتے تھے۔

بارش چونکہ بہت زیادہ ہوتی تھی اس لیے پہاڑیوں سے مٹی بہہ کر آتی تھی جو فصلوں کے لیے بہت مفید ہوتی تھی اور کسی دوسری کھاد کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گیہوں، چاول، چنا اور مختلف دالیں بہت فراوانی سے پیدا ہوتی تھیں۔ گیہوں کئی قسم کا ہوتا تھا۔ پسی اور کٹھیا عام تھا۔ چاولوں میں دل بخشا اس قدر خوشبودار ہوتا تھا کہ جب وہ پکایا جاتا تو کئی گھروں تک اس کی خوشبو پہنچتی تھی۔ ہرت گنڈی، بانس متی، مچھری، منگا، اُری بُوٹا وغیرہ بھی چاولوں کی اقسام تھیں۔ بکثرت تالاب، چشمے اور ندیاں تھیں تو ان میں بے شمار اقسام کی مچھلیاں ہوتی تھیں۔ بعض کے نام یہ

ہیں: مہاشیر، پڑھن، ریہو (روہو)، سونٹھ (سول) گیگرا (زرد رنگ کی چھوٹی مچھلی جو کسی قدر یہاں کی کپتا مچھلی کی مشابہ ہوتی ہے۔ بہت لذیذ ہوتی ہے۔)، بام، لانچی، کنوا، مگورا، سینگی، سوجا وغیرہ۔ شیشم کے درخت بکثرت ہوتے تھے۔ آم، جامن، کیتھ، آملہ، بلیلہ، بلیلہ، ڈھاک نیم وغیرہ عموماً خودرو تھے۔ درندوں میں شیر، چیتا، گل باگ (تیندوا)، بھیڑیا، لکڑ بھگا، سیی (خارپشت) وغیرہ تھے۔ شکار کے جانوروں میں ہرن، چیتل، نیل گائے، سانبھر، جنگلی بھینسا، چیکارا وغیرہ۔ پرندوں میں مور، سارس، مرغابی، گلگل (جو بگلے کی طرح پرندہ ہے)، گوریا، کبوتر، ہُدہُد، نیل کنٹھ، تیتر عام ہیں۔

میں نے ایک بڑا پرندہ ایسا دیکھا تھا جس میں مختلف رنگ تھے اور اس کی لمبی چونچ تھی جس میں کئی سوراخ تھے۔ وہ جب اللہ تعالیٰ کی یاد میں آواز نکالتا تھا تو عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ سانپوں کی بھی کثرت تھی۔ سیاہ سانپ بڑا بھی اور چھوٹا بھی، سبز رنگ، زرد رنگ، کوڑیا وغیرہ۔ میں نے ایک مرتبہ سفید سانپ بھی ایک پہاڑ میں دیکھا تھا۔ مرگھٹ میں سانپ بہت دیکھے کہ وہ عذاب الٰہی سے ہوں گے۔ ایک سانپ کو ہندو لوگ "سیتا کی لٹ" کہتے تھے۔ وہ بکثرت پایا جاتا تھا۔ بچھو سیاہ اور کتھئی رنگ کا ہوتا تھا۔ کئی دوسرے موذی جانور بھی ہوتے تھے جو پہاڑیوں میں رہتے تھے۔

تمام پہاڑیاں اور میدان سرسبز تھے۔ سیرگاہیں بہت تھیں۔ شہر سے جنوب و مغرب کی طرف قریب ۶-۷ میل کے فاصلے پر مدن محل ہے۔ یہ دو منزلہ محل صرف ایک وسیع چٹان پر قائم ہے۔ جسے رانی درگاوتی نے بنوایا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک تالاب نما حوض ہے جہاں رانی کا غسل خانہ بھی ہے۔ اس رانی کا تمام علاقہ جبل پور اور گڑھا سے لے کر منڈلہ تک عہد اکبری میں مغلوں کے زیر نگیں آگیا تھا۔ اس محل سے کچھ پہلے ایک بہت بڑی چٹان ایسی بھی ہے جو قریب ۳۰ فٹ لمبی اور ۱۵ فٹ چوڑی ہوگی اور وہ صرف ایک چھوٹی سی چٹان پر جو بمشکل ایک ہاتھ کی ہوگی، کھڑی ہوئی ہے۔ مدن محل کا نام رانی درگاوتی کے زمانے میں کیا تھا، معلوم نہیں لیکن وہ بعد کے بزرگ مدن شاہ کی وجہ سے مدن محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس بزرگ کا مزار محل کے جنوب میں کچھ فاصلے پر ہے اور اس محل کے شمال میں کچھ فاصلے پر مسلمانوں نے ایک مسجد کی طرح احاطہ بنایا ہے جس کے ایک کونے میں (کہا جاتا ہے کہ) بغداد شریف کی ایک اینٹ نصب ہے اور لوگ وہاں حال کھیلتے ہیں۔

شہر سے قریب بارہ میل کے فاصلے پر (مغرب کی طرف) دریائے نربدا کا ایک گھاٹ "بھیڑا گھاٹ" کہلاتا ہے۔ وہاں دو پہاڑوں کے درمیان دریا بہت تنگ ہو گیا ہے۔ پھر اس کا تیز رفتار پانی آگے اس زور سے گرتا ہے کہ وہاں انسان اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتا۔ وہ پانی پھر آبشار بنا دیتا

ہے۔ جہاں سنگ مرمر کی چٹانیں بھی ہیں اور چاندنی راتوں میں وہ منظر بہت دلکش نظر آتا ہے۔

شہر کے دوسرے مقامات بھی پانی کے چشموں اور پہاڑوں کی وجہ سے بہت دلکش ہیں۔ قدرتی پیداواروں میں عقیق کے ٹکڑے بہت ملتے ہیں۔ اور شکار کے بہت مواقع ہیں۔

محلہ بھان تکیا میں میرے والد صاحب نے ایک مکان ۱۹۱۹ء میں ایک سو دس روپے میں خرید لیا تھا۔ وہ خاصا وسیع تھا۔ پھر اسی سے ملحق مکان ساٹھ روپے میں خرید لیا تھا۔ اسلئے مزید وسعت ہو گئی تھی۔ یہ رقم میرے وظیفے کی تھی جو مجھے پرائمری کے امتحان میں پورے شہر میں اول آنے سے ملی تھی اور اسے والد صاحب نے محفوظ رکھا تھا۔ اس محلے کے لوگ سیدھے سادے تھے۔ زیادہ تر سبزی فروش تھے۔ برکت اللہ کے بھائی ابراہیم، ان کی والدہ اور بہن وغیرہ بہت خلوص رکھتی تھیں۔ ایک پڑوسی حبیب اللہ تھے۔ وہ بھی بہت تعلق رکھتے تھے۔ البتہ ایک خاندان جو خود کو سید کہلاتا تھا، عجیب حالت میں تھا۔ ان کے یہاں کے ایک بھائی اور ایک بہن نے خود کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے آمین۔ محلے میں دو مسجدیں تھیں۔ ہم لوگوں کو ان کی خدمت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضل سے عطا فرمائی تھی۔

میرے مکان سے قریب دو فرلانگ پر (شمال و مشرق کی طرف) پہاڑی سے کئی چھوٹے چھوٹے چشمے جاری رہتے تھے۔ وہاں اکثر ہم لوگ چلے جاتے تھے۔ ایک جگہ جھرنا (چشمہ) بہت صاف پانی کا تھا۔ لوگ اسے جھتّو کہا کرتے تھے۔ اسی سے آگے مشرق کی طرف اور بائیں ہاتھ پر دو بڑی بڑی چٹانیں تھیں جن پر اگر لاٹھی ماری جائے تو ٹن ٹن کی آواز آتی تھی اس کا نام ہم لوگوں نے "جبل فاروق" رکھا تھا۔ اچھی سیرگاہ تھی۔ اس کے قریب بڑا مدار چلہ ایک پہاڑی پر تھا اور اس سے مغرب کی طرف چھوٹا مدار چلّہ تھا۔ خدا جانے یہ نام کس طرح مشہور ہوئے۔ چھوٹے مدار چلے کے قریب میری نانی صاحبہ کی قبر تھی۔ بہت بڑا قبرستان اس کے ساتھ تھا۔ اور ایک جگہ چند چٹانوں کی درمیان تھوڑی سی جگہ تھی۔ وہاں کسی بزرگ کی قبر تھی۔ میں اکثر تنہائی میں وہاں بیٹھا کرتا تھا اور بڑا سکون حاصل ہوتا تھا۔

محلہ بھان تکیا کا نام ہم لوگوں نے نواب زادہ لیاقت علی خان کے نام پر نواب گنج رکھ دیا تھا۔ وہاں کالی کا بڑا مندر تھا اور اس کے جنوب میں املی کے بڑے بڑے درختوں کا باغ تھا۔ محلہ کے پولیس تھانے سے جنوب کی طرف محلہ بیل باغ تھا جس کے مشرق کی طرف آگے جاکر گھما پور اور اس کے آگے گن کیرج فیکٹری تھی۔ بیل باغ سے جنوب کی طرف سیدھی سڑک صدر کو جاتی تھی اور قریب ایک میل کے بعد بائیں طرف عدالتوں کی عمارتیں تھیں اور ان کے قریب ریلوے اسٹیشن تھا۔

بعض احباب :۔

میرے چند مسلمان دوست یہ تھے۔ سید محمد سعید، محمد یوسف، مرتضیٰ، عبدالسبحان، حافظ عبدالعزیز، حافظ عبدالشکور، حافظ محمد ادریس، حافظ عبدالرشید، حافظ غلام محمد، حافظ محمد مبارک، حافظ جمال الدین صاحب کے بھائی عبدالقادر، حافظ عبدالسلام، دوسرے عبدالقادر اور ان کے بھائی حافظ عبدالرحیم اور عبدالکریم۔ ایک عبدالرزاق بھی تھے جو محلے کے بزرگ عبدالرحیم کے بیٹے تھے۔

ہندو دوستوں میں خوب چند، گیا پرشاد، سوہن لال بہت تعلق رکھتے تھے۔ غالب کا ایک مصرع ہے : ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ کسی کی ڈاڑھی بہت باریک ہوتی تو یہ مصرع پڑھا جاتا۔ اور مول چند، خوب چند، ہرچند کوئی بات صحیح نہیں کہتے تب بھی یہ مصرع دہرایا جاتا۔ وہ زمانہ بہت سیدھا سادہ تھا۔ درختوں کی مڑی ہوئی شاخیں کاٹ کر لے آتے تھے وہی ہم لوگوں کی ہاکی اسٹک ہوتی تھی۔ کبھی بازار سے بھی خرید لیتے تھے۔ لیکن شکر ہے کہ احباب سبھی نمازی تھے۔ البتہ قرآن خوانی کی محفلوں میں بعض احباب بالکل آخری وقت میں آتے تھے تو مجبوراً کہنا پڑتا تھا کہ آپ نے دور اندیشی سے کام لیا کہ زیادہ تلاوت بھی نہ کرنی پڑی اور حصہ بھی پورا حاصل کیا۔

بچپن میں ہنسی مذاق کی باتیں عین زندگی ہوتی ہے۔ ایک بڑے میاں سے ملاقات ہوئی تو مختلف لوگوں کا ذکر آیا۔ فرمانے لگے کہ وہ میرے سامنے ننگے پھرتے تھے۔ میں نے کہا وہ لوگ بڑے بدتمیز تھے کہ آپ کے سامنے ننگے پھرتے تھے۔ بڑے میاں بولے، نہیں نہیں، میرا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ مجھ سے بہت زیادہ چھوٹے تھے۔ پھر کسی اور بڑی عمر والے کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ ہاں وہ مجھ سے بڑے تھے۔ تو میں نے کہا کہ پھر تو آپ ان کے سامنے ننگے پھرتے رہے ہوں گے۔ بڑے میاں جھلا کر چپ ہو رہے۔ لیکن ہم لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔

سید محمد سعید جو بعد میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہو گئے تھے اور کراچی میں ۱۹۶۹ء میں فوت ہوئے، دن بھر ہنساتے رہتے تھے۔ موسم گرما میں دوپہر کے وقت لحاف اوڑھ کر لیٹتے تھے۔ میں کہتا کہ یہ کیا غضب کرتے ہو! وہ کہتے کہ دیکھو، دیواروں پر لکھا ہوا ہے کہ "گرم چائے گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے" اسی طرح گرم لحاف بھی گرمی میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ تفریح گاہوں میں ہم لوگ جاتے اور کھانا پکاتے۔ ایک دن سید محمد سعید نے ایسا حلوا پکایا کہ برتن میں نیچے والے حصے میں جم گیا۔ اس سے اوپر کچھ غنیمت تھا اور سب سے اوپر کچھ کچا تھا۔ فرمانے لگے کہ میرے کمال کی داد دینا چاہئے کہ ایک ہی دیگچی میں تین قسم کا حلوا پکا سکتا ہوں۔ ایک وقت ایک بڑے میاں ہمارے قریب سے گزرے۔ انھی نے پہلے سلام کیا، تو جواب میں کہا گیا کہ جیتے رہو، خوش رہو، اللہ عمر دراز کرے، یعنی آپ بوڑھے

ہیں تو آپ کو ایسی دعاؤں کی زیادہ ضرورت ہے۔ نماز کے سلسلے میں بھی بعض عجیب و غریب لطیفے ہوئے ہیں۔ مقدم گنج کی مسجد میں میرے خالہ زاد بھائی محمد حسین صاحب نماز پڑھاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں مغرب کے وقت محمد یوسف کے ساتھ وہاں پہنچا تو نماز ہو چکی تھی۔ میں نے محمد یوسف کے ساتھ دوسری جماعت شروع کی تو ایک صاحب آئے اور انہوں نے محمد یوسف کو پیچھے کر لیا۔ پھر ایک اور صاحب آئے وہ سمجھے کہ یہ دونوں جماعت کر رہے ہیں تو انہوں نے بھی محمد یوسف کو پیچھے اپنے ساتھ کر لیا۔ ہنسی کے مارے ہم لوگوں کا برا حال تھا۔ لیکن ضبط کرتے رہے اور بمشکل نماز پوری کی۔

ایک واقعہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر محمد سعید کے ساتھ ان کے محلے کی چھوٹی مسجد میں مغرب کے وقت جانا ہوا۔ ایک صاحب معمر وہاں آ گئے انہوں نے مغرب کی جماعت پڑھائی لیکن شروع کی دونوں رکعتوں میں الحمد اور سورۃ پڑھنے کے بعد بغیر اللہ اکبر کہے ہوئے وہ رکوع میں چلے گئے جب سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر وہ کھڑے ہوئے تو ہم لوگ رکوع میں گئے۔ نماز کے بعد ان سے عرض کیا کہ آپ کا خیال ہوگا کہ "عقلمند را اشارہ کافی است" یعنی جب الحمد للہ اور سورۃ بھی پڑھ لی تو رکوع میں جانے کے لیے اللہ اکبر کہنے کی کیا ضرورت رہی؟ وہ صاحب شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

اسکول اور کالج :-

شہر کے علاقے میں اردو کے پرائمری اسکول تین تھے۔ دلہائی محلے میں، کھنٹیک محلے میں اور اومتی محلے میں (صدر کے علاقے میں بھی ایک اسکول تھا) ۱۹۱۷ء میں ہم لوگ کٹنی (ضلع جبل پور) میں تھے۔ وہاں چھیپا محلے میں ایک اسکول تھا۔ اس کی پہلی کلاس میں میرا داخلہ ہوا۔ اس اسکول کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ تمام بچوں کے لیے اسکول کی طرف سے کالی شیروانی اور ترکی ٹوپی (صرف کسی تقریب کے موقع پر) مہیا کی جاتی تھی۔ اس سال کے آخر میں ہم لوگ جبل پور آ گئے۔ پہلے کھائی محلے میں قیام تھا۔ بعد میں محلہ بھان تلیا آ گئے۔ وہاں والد صاحب نے ۱۹۱۹ء میں ایک مکان خرید لیا۔ کیونکہ بعض اعزہ وہیں رہتے تھے۔ میرا داخلہ دلہائی محلے کے اسکول میں ہو گیا۔ لیکن چوتھی جماعت پاس کر کے وہاں سے میں کھنٹیک محلے کے اسکول میں منتقل ہو گیا۔ اس زمانے میں پرائمری اسکول میں پانچ جماعتیں تھیں۔ لیکن میں نے چار سال میں یہ جماعتیں پاس کر لیں۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید حبیب اللہ صاحب تھے۔ بڑی شفقت فرماتے تھے۔ خوش نویسی بھی سکھلاتے تھے۔ اس کی مشق سے مجھے جغرافیہ کے نقشے بنانے میں درست حد بندی کی عادت ہو گئی اور میرے بنائے ہوئے نقشے میرے ساتھی مجھ سے مانگ لیتے تھے۔ پرائمری کے آخری امتحان میں پورے شہر میں اول قرار دیا گیا اور چار سال تک کے لیے چار روپے ماہانہ وظیفہ میرے لیے مقرر ہوا۔ پھر میرا داخلہ انجمن اسلامیہ ہائی

اسکول میں ہوا۔ وہاں کے سب اساتذہ سخت محنت اور بڑی شفقت سے پڑھاتے تھے۔ بہادر ماسٹر صاحب پہلی انگریزی پڑھاتے تھے۔ بہت محنتی اور بہت مقبول تھے۔ وہ عیسائی تھے۔ لیکن مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحئی صاحب، مولانا عزیز الحسن صاحب، رحیم اللہ خان صاحب، رشید اللہ خان صاحب، غلام جیلانی صاحب، وغیرہ بھی شفقت فرماتے تھے۔ ہندو لڑکے بھی وہاں پڑھتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں ایک استاد کو اپنے ایک شاگرد کے متعلق خوش فہمی تھی کہ وہ بورڈ کے امتحان میں اول آئے گا۔ لیکن ماسٹر رحیم اللہ صاحب اس کے متعلق فرماتے تھے کہ وہ فیل ہو جائے گا اور میرے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ آخر یہی ہوا۔ یہ ماسٹر صاحب میری خوش خطی سے بھی بہت خوش ہوتے تھے اور مجھ سے تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق Notes لکھوا کر طلبہ میں مفت تقسیم کرتے تھے۔ اسی اسکول سے میں نے نویں جماعت کا امتحان ۱۹۲۸ء میں پاس کیا اور دسویں (میٹرک) کے لیے علی گڑھ چلا گیا۔

جبل پور میں ہمارے اسکول کے علاوہ ہتکارنی ہائی اسکول، ماڈل اسکول، مشن اسکول اور کرسچین اسکول بھی تھے۔ لیکن کھیلوں میں ہمارے اسکول کے طلبہ ہی کو زیادہ تر کامیابی حاصل ہوتی تھی۔ مختلف دوڑوں میں اور لانگ جمپ میں عبدالقیوم، پھر ان کے بھائی عبدالحئی اور عبدالسلام کے مقابلہ کا کوئی بھی نہیں تھا۔ ہائی جمپ اور پول جمپ میں اسمٰعیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دوسرے کھیلوں میں بھی ہمارے اسکول کے طلبہ بہت آگے تھے۔

ممالک متوسط و برار C.P. & Berar کا ایک ہی صوبہ تھا۔ اس میں سرکاری کالج پانچ تھے۔ جبل پور میں Robertson College، ناگ پور میں Morris College اور امراؤتی میں King Edward College۔ ناگ پور میں سائنس کالج اور میڈیکل کالج بھی سرکاری تھے۔ بی ٹی کالج بھی وہیں تھا جو یونیورسٹی نے قائم کیا تھا۔ جبل پور میں بھی ٹریننگ کالج تھا۔ ناگ پور میں Hislop College اور City College پرائیوٹ تھے۔ پھر رائے پور اور ساگر میں بھی پرائیویٹ کالج قائم ہو گئے تھے اور یہ سب کے سب ناگ پور یونیورسٹی کے تحت تھے۔ بعد میں ۱۹۴۶ء سے Sir Hari Singh Gour نے ساگر یونیورسٹی قائم کر دی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد اور بھی کئی تبدیلیاں اور اضافے ہو گئے ہیں اور اب جبل پور میں بھی یونیورسٹی قائم ہو گئی ہے۔

اب کچھ طبقات کا ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا۔

علماء اور مشائخ :-

عام دستور کے مطابق پورے ملک میں ہر داڑھی والا شخص مولانا اور مولوی کہلایا جاتا تھا۔ جبل پور

میں بھی یہی دستور تھا۔ اور صحیح قسم کے علماء بہت کم تھے۔ محلہ اندھیر دیو میں مولانا عبدالکریمؒ اور ان کے صاحبزادے مولانا عبدالسلامؒ اور ان کے صاحبزادے مولانا برہان الحقؒ بڑے علماء میں سے تھے پھر یہ حضرات اس محلے سے منتقل ہو کر دیچھت محلے میں آگئے تھے اور کوتوالی کی مسجد میں نماز پڑھاتے تھے اور وعظ بھی فرماتے تھے۔ دوسرے اچھے علماء بھی تھے لیکن ان کی شہرت نہیں تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ دیوبندی اور بریلوی معرکے اس زمانے میں بہت تھے۔ اس لیے بعض علماء نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ بریلوی حضرات نے دیوبندیوں کے لیے ایک مصرع تاریخی اس طرح بنایا تھا:۔

ش س • • • گنگوہ و خ • • • تھانہ بھون

اور دیوبندی حضرات نے ان کے متعلق یہ مصرع بنایا تھا:

ا...... کی پوں پوں ۔ ح...... کی کوں کوں

بریلوی حضرات کی تقریروں میں عموماً اہل حدیث اور دیوبندی حضرات پر لعن طعن ہوتی تھی اور کوئی علمی بات نہیں ہوتی تھی۔ (۱) ایک مرتبہ پورا وعظ رفع یدین کے خلاف ہوتا رہا۔ کہ یہ لوگ مکھی مچھر کو بھگاتے رہتے ہیں۔ ان کی نمازوں میں ان کو اسی لیے سکون حاصل نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ قریب ایک گھنٹے تک خوب لے دی ہوئی۔ آخر میں ایک جملہ فرمایا۔ ہاں شافعی لوگ ضرور رفع یدین کرتے ہیں۔ ایک وعظ میں فرمایا کہ میں نے بریلی شریف سے فتویٰ منگوالیا ہے کہ آپ لوگ میرے پاؤں چوم سکتے ہیں۔ چنانچہ اس وعظ کے بعد کچھ لوگوں نے ان کے پاؤں چوم لیے۔ لیکن بعد میں پھر کوئی بھی ان کے پاؤں چومتا ہوا نظر نہیں آیا۔ وہیں خود ان کا یہ فتویٰ تھا کہ ہندو لوگ اگر تمہاری مسجدوں کے قریب سے باجا بجاتے ہوئے گزریں تو فوراً گائے ذبح کیا کرو۔ ان کے فتویٰ کے بعد چند مسجدوں میں گائے ذبح ہوتی رہی۔ اسے وہ کفارہ کہتے تھے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد کفارہ کا فتویٰ واپس لے لیا گیا۔

میلاد شریف ہر طبقے کے علماء میں رائج تھی۔ یعنی اہل حدیث اور دیوبندی حضرات بھی ربیع الاول میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور احسانات کے متعلق برابر وعظ کرتے تھے۔ صرف قیام نہیں کرتے تھے۔ بریلوی حضرات قیام کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن آج کل کے بریلویوں کی طرح ان کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میلاد شریف کے وقت تشریف لے آتے ہیں اس لیے کھڑے ہو کر سلام پیش کرنا چاہیے۔ اُس وقت یہ عقیدہ بھی نہیں تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں۔ میں نے بریلوی حضرات کے یہاں میلاد شریف میں عموماً یانبی سلام

۱۔ مولانا احسن مارہروی نے اپنی کتاب نمونہ منثورات کے صفحہ ۳۲۸۔ ۳۳۱ میں ایک بہت بڑے عالم کی سخیف تحریر کے نمونے پیش کیے ہیں۔

علیک پڑھتے سنا ہے۔ مولانا احمد رضا خانؒ کا یہ سلام کبھی نہیں سنا کہ:۔ مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام۔ بریلوی حضرات کی بعض مسجدوں میں (کوتوالی مسجد، پھوٹا تال کی مسجد اور کبھی اومتی کی مسجد میں) غالباً ۱۹۳۸ء کے بعد کسی کسی نماز سے پہلے صلوٰۃ و سلام پڑھا جانے لگا تھا۔ میرے بچپن کے (۱) دوست سید محمد سعید صاحب کے مکان میں جب ایصال ثواب کیا جاتا تھا تو سامنے کھانا رکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ کٹر بریلوی تھے۔

راقم الحروف کے محترم استاد مولانا سید سلیمان اشرف صاحبؒ (علی گڑھ میں) تھے۔ وہ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ لیکن ہمیشہ مولانا ابوبکر محمد شیثؒ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، جو دیوبندی تھے اور وہ (یعنی مولانا سلیمان اشرف صاحبؒ) ہمیشہ تکبیر شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے وہ خود بھی کبھی نماز پڑھاتے تھے تو دعا میں انہوں نے کبھی ان اللہ وملئکتہ والی آیت نہیں پڑھی اور انہوں نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ جمعے کے خطبے کی اذان صحن میں ہونی چاہیے۔ (امام کے سامنے نہیں ہونی چاہیے) لیکن جبل پور میں تکبیر کی حی علی الصلوٰۃ پر لوگ کھڑے ہو جاتے تھے اور جمعہ کے خطبے کی اذان بعض مساجد میں صحن میں ہوا کرتی تھی۔ پھر آج کل کے بریلوی حضرات کی طرح جبل پور کے بریلوی حضرات اشہد ان لا الٰہ الا اللہ۔ اشہد ان محمد رسول اللہ پر رفع سبابہ بھی نہیں کرتے تھے۔ بہرحال۔ جبل پور کے بریلوی حضرات، غیر بریلوی حضرات، سے نفرت کرنے کے باوجود، ہندوؤں سے لڑائی کے وقت ان سے (غیر بریلوی حضرات سے) دوستی کر لیتے تھے اور بعد میں مسلم لیگ کے جلسوں میں بھائی بھائی بن جاتے تھے۔

جبل پور میں مشائخ حضرات خواہ کسی مکتب خیال کے ہوں۔ لوگوں کو مرید بنالیتے تھے۔ گو کہ ان کی اصلاح اور متشرع زندگی کے لیے کوئی تاکید نہیں فرماتے تھے۔ نذرانہ اور "دست غیب" سے بھی تعلق زیادہ رکھتے تھے۔ ایک پیر صاحب کے یہاں میں نے ایک فہرست مریدوں کی دیکھی جس میں ہر مرید کے ذمے (اس کی حیثیت کے مطابق) نذرانہ مقرر کر دیا گیا تھا اور وہ نذرانہ مرید ضرور ادا کرتا تھا۔ ورنہ مریدی سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ ایک پیر صاحب سے کوئی شخص مصافحہ کرتا تو پیر صاحب فوراً اپنا ہاتھ اس کے منہ کے قریب کر دیتے تھے تاکہ اسے ہاتھ چومنے میں دقت نہ ہو۔

ہمارے شہروں کے پیروں کا ذریعہ آمدنی عموماً یہی نذرانہ ہوا کرتا تھا یا وہ میلاد شریف پڑھنے

۱۔ سید محمد سعید میرے بڑے عزیز دوست تھے۔ بریلوی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اہل حدیث اور دیوبندی حضرات کو برا بھلا کہتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ یہ تو بتاؤ کہ ان لوگوں میں حفاظ بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ (لاَیَمَسُّہٗ اِلاَّ الْمُطَہَّرُوْن) تو کیا تم حافظوں اور مطہر لوگوں کو کافر کہنا پسند کرتے ہو؟ اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی ان لوگوں کو کافر نہیں کہا۔

کے لیے مختلف شہروں کا دورہ کر کے وصولی کیا کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اب بھی یہی کاروبار ہے۔

ایک پیر صاحب نے بہت سی گانے والی عورتوں کو بھی مرید بنالیا تھا۔ ان سے قوالی سنتے تھے اور اپنے شیخ کے عرس کے موقع پر ان عورتوں کو جلوس میں لے کر چلتے تھے۔ عشاء کے بعد ان عورتوں کی وجہ سے قوالی میں اتنا مجمع ہو جاتا تھا کہ دوسرے پیروں کو رشک آتا ہوگا۔

شہر کے پیروں میں ۳۔ ۴ ہی زیادہ نمایاں تھے۔ صدر کے علاقے میں بھی ایک دو پیر تھے لیکن اُن میں اتنا زور و شور نہیں تھا۔

ایک پیر صاحب نے ایسی ترقی کی کہ پیغمبر بن گئے۔ محلہ پھُوٹا تال میں رہتے تھے۔ پولیس میں سب انسپکٹر رہ چکے تھے۔ کچھ لڑکوں کو دعوت کھلا کھلا کر مجمع جمع کر لیا تھا۔ پھر پیغمبری کا دعویٰ کر دیا۔ فرمانے لگے کہ مجھ پر بائبل (انجیل) صحیح طور پر نازل ہونے والی ہے۔ لڑکوں نے ان کو تماشا بنالیا۔ کسی کباڑی سے بائبل کا ایک پرانا نسخہ لے آئے اور ان کے گھر کے اوپر سے صحن میں پھینک دیا۔ پیر صاحب فرمانے لگے کہ دیکھو مجھ پر بائبل نازل ہو گئی ہے۔ لڑکوں نے کہا کہ اس کو لندن سے چھپوانا چاہئے اور وہاں یہ نسخہ ڈاک سے نہیں بھیجیں گے بلکہ دریائے نربدا کے ذریعے بھیجیں گے۔ دریائے نربدا سے بحر ہند، بحر احمر، بحر روم وغیرہ ہوتا ہوا وہ انگلش چینل سے لندن پہنچ جائے گا۔ چنانچہ پیر صاحب (بلکہ پیغمبر صاحب) کو دریائے نربدا لے چلنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس ندی کا قریب ترین گھاٹ (گواری گھاٹ) تقریب ۷ میل پر تھا۔ لڑکوں نے پیر صاحب کو یہ راستہ پیدل چلایا اور شاباشی دیتے رہے۔ وہ نسخہ پیر صاحب کے سر مبارک پر رکھا گیا اور گواری گھاٹ میں دریا میں پھینکا گیا۔ پھر اسی ذریعے سے کچھ عرصے کے بعد لندن سے خط منگوا لیا گیا کہ وہ نسخہ خیریت سے پہنچ گیا ہے اور اب چھپنے کی دیر ہے۔ بہر حال خوب تفریح رہی اور پیر صاحب اپنی پیغمبری سے مطمئن ہو گئے۔

شعراء :-

برصغیر پاک و ہند میں مشاعرے عام ہیں۔ غیر طرحی مشاعروں میں ایسے شعراء بھی شریک ہو جاتے ہیں جو غیر معروف شعراء کی غزلوں میں اپنا تخلص ڈال دیتے ہیں۔ جبل پور میں بھی کچھ اسی طرح ہوتا تھا۔ لیکن وہاں بعض باکمال شعراء بھی تھے۔ عبدالرزاق بیکسؔ (م ۱۳۴۰ھ) بہت اچھے شاعر تھے جو شمشاد لکھنوی (م ۱۳۳۵ھ) کے شاگرد تھے۔ بیکس کا دیوان ۱۹۶۵ء میں سکھر سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن بھی ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے مثنوی "کشتۂ ناز" لکھی تھی۔ دوسرے سال مثنوی "شام غربت" لکھی۔ پھر ۱۹۱۳ء میں "الفتوح الآخرہ" کے نام سے "ہفت بند کاشی" کی طرح سات بند (براثی میں) لکھے جو فارسی میں ہیں۔ اعلیٰ

اور کسیرو (پھل) کے متعلق چھوٹی نظمیں اردو میں لکھی ہیں۔ فارسی، عربی اور اردو میں قطعات تاریخ بھی ہیں۔

دوسرے شاعر حکیم شیخ عبدالرحیم مذاق (م ۱۳۴۳ھ) تھے۔ ان کا نعتیہ کلام "ریاضِ نورانی" کے تاریخی نام سے ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ نام مولانا احسن مارہروی کے شاگرد کلیم (۱۳۸۱ھ) نے رکھا تھا۔ ۱۳۴۰ھ میں مرثیوں کے متعلق ان کا ایک مجموعہ "مطلع خورشید الم" کے تاریخی نام سے شائع ہوا تھا۔

اسی زمانے میں عبدالحمید خاں کوئی المتخلص زیبا تھے۔ (ایک مناسبت سے یہ تخلص تھا)۔ انہوں نے غزلیات بہت لکھیں اب مجموعہ کلام نایاب ہے۔ انہوں نے شعر و شاعری پر زیادہ وقت صرف کیا اور بہت سے شاگرد تیار کیے۔ وہ انجمن ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ پھر ایک باکمال شاعر محفوظ الکریم (م ۱۳۸۱ھ) بھی تھے۔ جو مولانا احسن مارہروی (۱۳۵۹ھ) کے خاص شاگردوں میں تھے اور ان کے تعلق کی وجہ سے ایک مرتبہ مولانا احسن، جبل پور تشریف لائے تھے۔ ان کی غزلیات کا ایک ضخیم مجموعہ تھا جس پر راقم الحروف کا مضمون رسالہ اردو (دہلی۔ جنوری ۱۹۳۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے تاریخی قطعات بکثرت لکھے تھے۔ افسوس کہ یہ مجموعے شائع نہ ہو سکے۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کون آیا ہے خانۂ دل میں — کس کی تعظیم کو یہ اٹھا درد

مول خود لیتے ہیں درد سر کلیمؔ — پھر کہو گے ہائے میرا سر گیا

مناسب تھا یہ ساماں ساتھ اپنے نامہ بر لیتا — تقاضا میرے دل سے، میری آنکھوں سے نظر لیتا

اے چارہ گر بتا کہ دکھاؤں کدھر کی چوٹ — دل کی؟ جگر کی؟ سینے کی؟ سر کی؟ کمر کی چوٹ

تھا اور کون ہجر میں تسکین کو میرے پاس — آزردگی تھی، رنج تھا، غم تھا، ملال تھا(۱)

اطباء :-

میرے بچپن میں حکیم الفت خاں (کھائی محلہ) اور حکیم محمد اسمٰعیل (پھوٹا تال) اور حکیم محمد حسین (جوڑی تکیا) زیادہ مشہور تھے۔ حکیم الفت خاں باقاعدہ حکیم نہیں تھے لیکن ان کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے بڑی شفاء رکھی تھی۔ یہی حال حکیم محمد اسمٰعیل کا تھا۔ ان کی دواؤں میں اللہ تعالیٰ نے

---

(۱)۔ راقم الحروف نے ان کے قطعات تاریخ کے مجموعہ گنجینۂ تاریخ (۱۳۴۹ھ) پر نو اشعار اور ان کے انتقال (۱۳۹۱ھ) پر تین اشعار لکھے تھے جن کا ہر مصرع تاریخی ہے۔

نے بڑا اثر عطا فرمایا تھا۔ حکیم محمد حسین (الہ آبادی) بڑے قابل تھے اور مختلف علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ میرے ماموں مولانا عبدالمجید خان (م ۱۳۷۱ھ) اور حکیم شیخ عبدالرحیم مذاق (م ۱۳۴۳ھ) نے انہی سے طب پڑھی تھی۔ بہت لوگ ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ بعد میں مولانا برہان الحق نے بھی مطب کھول لیا تھا۔ حکیم بشیرالدین امروہوی (م ۱۳۴۳ھ) (کھٹیک محلہ) بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ پھر ایک قابل حکیم ثمرالدین، میونسپل دواخانہ میں آ گئے تھے۔ ان کی بڑی شہرت ہوئی۔ لیکن وہ اور ان کے بچے تفریح کے لیے اپنی کار میں جا رہے تھے کہ بے خیالی میں ان کی کار ایک ندی میں چلی گئی اور سب ڈوب گئے۔ ایک قابل حکیم عبدالغفور ٹونکی تھے (جن کا ابھی کراچی میں ۱۹۹۳ء میں انتقال ہوا ہے۔) وہ اپنے مجرب نسخوں کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ان کے بڑے بھائی حکیم حاذق فضل الرحمٰن ٹونکی یہاں حیدر آباد میں تھے۔ بہت نامور حکیم تھے اور حکیم اجمل خاں دہلوی کے خاص شاگرد تھے۔ (۱) دیچھت محلے میں حکیم محمد یٰسین خان بہت مشہور اور مقبول تھے۔ بہت سستی اور نفیس دوائیں دیتے تھے۔ ڈاکٹر بہت کم تھے۔ میرے بچپن میں ڈاکٹر عمر خان مشہور تھے۔ پھر ڈاکٹر امیر خان مشہور ہوئے اور نئے ڈاکٹروں کا اضافہ ہوا۔

بعض شخصیتیں :۔

میرے بچپن میں ایک صاحب بہت مشہور تھے۔ بظاہر شریعت کے پابند تھے۔ نماز، قرآن اور تسبیح سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ لیکن غریبوں کی امداد کے لیے بعض غیر شرعی کام کیا کرتے تھے۔ شاید ان الحسنٰت یذھبن السیئات سے ایسے کاموں کے لیے جواز تلاش کرتے تھے۔ ان کے گھر میں جُوا کھیلا جاتا تھا۔ ان کے گھر میں ڈبل دیواریں تھیں۔ پولیس کے دفتروں سے ان کے گھر تک جگہ جگہ فقیر بیٹھے رہتے تھے۔ اگر کوئی پولیس والا ان کے یہاں جاتا تھا تو فقیر لوگ "دے خدا کی راہ پر" صدا لگاتے تھے اس طرح ان کو اطلاع ہو جاتی تھی۔ اور جوا کھیلنے والے ان کے گھر کی دیواروں میں چھپ جاتے تھے۔

ان صاحب کے بکثرت چیلے تھے جو جبل پور سے بمبئی تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ لوگ سفید کرتہ (اندر بنیان) اور سفید دھوتی (جس کے اندر لال لنگوٹ) پہنتے تھے اور ان کا کام ہی ڈاکا ڈالنا تھا۔ جس سے غریبوں اور بیواؤں کی مستقل امداد کی جاتی تھی۔ اگر کسی شہر میں کسی پر ظلم ہوتا اور وہ ان صاحب سے فریاد کرتا تو اس کا مداوا بھی کر دیا جاتا تھا۔

ملک کے دوسرے شہروں کی طرح جبل پور میں بھی پہلوانی کا بہت شوق تھا۔ اور دور دور سے

(۱)۔ حکیم اجمل خان کی تاریخ کسی نے کیا خوب کہی ہے :۔ ع چوں قضا آید طبیب ابلہ شود (۱۳۴۶ھ)

پہلوان وہاں کُشتی لڑنے کے لیے آتے تھے۔ امرت سر کے پہلوان غلام قادر، غلام حیدر، غلام غوث (تینوں بھائی) مستقل طور پر ملونی گنج میں رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے مسلمانوں کو عزت حاصل تھی۔ بڑے نمازی اور خوش اخلاق تھے۔ ورزش سے ان کے بدن بہت خوبصورت بن گئے تھے۔ کشتی لڑتے تو پہلے اپنا رخ کعبے کی طرف کر لیتے، پھر اپنے حریف سے ہاتھ ملاتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان کو غالب کر دیتا۔ میرے محلے میں پہلوان غلام حسین تھے۔ جن کے داہنے ہاتھ کا پنجہ آتش بازی کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا لیکن ان سے بھی مقابلہ کرنے والا ہمیشہ مغلوب ہوتا تھا۔ کان پور سے چھوٹے قد والے پہلوان ادھا نام کے آیا کرتے تھے۔ ہندو پہلوان شرارت سے ماہِ رمضان میں ان کو چیلنج دیتا تھا۔ جب کہ عموماً عصر کے وقت کشتی ہوا کرتی تھی۔ لیکن وہ روزہ کی حالت میں بھی حریف کو شکست دیدیتے تھے۔ میری والدہ کے ماموں استاد جعفر خان اور ان کے بیٹے استاد عبدالباری خان (کٹنی میں) سب پر چھائے ہوئے تھے۔ میرے منجھلے بھائی عبدالرحمن خان گو کر کشتی نہیں لڑتے تھے لیکن پہلوانوں پر اُن کا رعب تھا۔ اسی طرح میرے ماموں حافظ محمد شفاعت خان اور ماموں حافظ محمد امان خان بھی (ٹونک میں) اپنی پہلوانی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی خاص رحمتیں نازل فرمائے آمین۔

جبل پور میں بفضلہٖ تعالیٰ بعض صحیح قسم کے اہل اللہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص رحمت ہے جو غالباً ہر جگہ اور ہر شہر میں فیض رساں ہوتی ہے۔ جبل پور کے محلہ ملونی گنج میں کابل کے محمد نور خانؒ رہتے تھے۔ وہ اس قدر زیادہ مراقبہ کیا کرتے تھے کہ دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ وہ فوت ہو گئے ہیں۔ شریعت کے سخت پابند تھے اور بکثرت لوگ فیض یاب تھے۔ شہر کے فوارہ سے مغرب کی طرف نمارث گنج ہے۔ وہاں سے گڑھا پھاٹک اور آگے رانی تال کا قبرستان ہے۔ شروع میں وہاں البیلا شاہ کی قبر ہے اور اس کے پیچھے محمد نور خانؒ کا مزار ہے۔ اسی نمارث گنج میں ایک مجذوب تھے جنہیں "ڈبے والے بابا" کہتے تھے۔ کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ نگاہیں ہمیشہ نیچی رکھتے تھے۔ وہاں سے ملونی گنج تک گشت کرتے تھے اور مسلمانوں کے لیے دعا فرماتے تھے :۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

محرّم :۔

جبل پور کا محرّم چند خصوصیات کا حامل تھا :۔ ۱۔ تعزیے۔ ۲۔ مرثیے پڑھنے والوں کا گروہ۔ ۳۔ سواریاں۔ ۴۔ نقلی شیر اور ۵۔ مختلف اقسام کے کھانے۔

تعزیے عموماً بانس کی تیلیوں سے بنائے جاتے تھے رنگین کاغذ ان تیلیوں کے چوکور خانوں پر چپکا دیا جاتا تھا۔ یہ خانے مزارات کی دیواروں اور دروازوں کی مختلف شکلوں پر مشتمل تھے۔ محلہ بھان تلیا میں ایک فقیر ان تیلیوں پر روئی لپیٹ کر مٹی چھاپ دیتا تھا اور رائی کے دانے اس مٹی میں بو دیتا تھا اور

چند روز تک ان پر پانی چھڑکتا تھا۔ وہ دانے پھوٹ کر پودے بن جاتے تھے۔ اسے رائی کا تعزیہ کہتے تھے۔ اسی محلہ میں دو منزل کی سبز کاغذ کی ایک ٹٹی جیسی دیوار بنائی جاتی تھی۔ اسے حضرت قاسمؑ کی مہندی کہتے تھے۔ لیکن دو تعزیے خاص تھے اور وہ ابرق کے ہوتے تھے اور کئی ماہ میں تیار ہوتے تھے۔ ایسا ایک تعزیہ کوتوالی والی مسجد کے پاس رکھا جاتا تھا۔ اس میں سادہ گنبد ہوتا تھا۔ لیکن جو تعزیہ چراغ علی کی مسجد کے قریب رکھا جاتا تھا اس میں جو گنبد ہوتا تھا وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے گنبد کے مطابق ہوتا تھا۔ یہ دونوں تعزیے بہت حسین ہوتے تھے اور دور دور سے لوگ انہیں دیکھنے کو آتے تھے۔ حضرت قاسمؑ سے منسوب تعزیہ جسے مہندی کہتے تھے وہ ۷ر محرم کو ظہر کے بعد اٹھائی جاتی تھی اور کچھ دور لے جاکر واپس اپنے مقام پر پہنچا دی جاتی تھی۔ پھر وہ ۱۲ر محرم کو رانی تالاب میں ڈبو دی جاتی تھی۔ لیکن دوسرے سب تعزیے ۱۰ر محرم کو اسی رانی تالاب میں ڈبو دیے جاتے تھے۔ تالاب شہر سے باہر اور مغرب کی طرف ہے۔ وہیں پرانا قبرستان ہے اور اہل حدیث حضرات کی عیدگاہ بھی وہیں ہے۔

کچھ گروہ بھی تیار کیے جاتے تھے۔ ۱۰۔ ۱۲ آدمی سبز رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ ہاتھ میں جھنجھنے یا چھوٹے چھوٹے ڈنڈے ہوتے تھے۔ ایک شخص مرثیہ پڑھتا تھا اور گروہ کے افراد مل کر جھنجھنے یا ڈنڈے بجاتے تھے۔ ۷ر محرم اور ۹ر محرم کی شام سے رات تک یہ گروہ مختلف دکانوں میں جاکر مرثیے پڑھتے تھے اور وصولی بھی کرتے تھے۔ اکثر مجلسوں میں ایک مرثیہ بڑے سوز کے ساتھ پڑھا جاتا تھا جس کا مطلع یہ ہے :-

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول — ان دنوں شہر مدینہ میں ہوا اُس کا نزول

۵. ۷. اور ۹ محرم کو بعض لوگ شیر بنتے تھے۔ لنگوٹ پہن کر پورے بدن میں زرد پینٹ اور ان پر شیر کی طرح کے سیاہ پٹے بنواتے تھے اور منہ میں شیر کی طرح کی زبان لے لیتے تھے اور وہ بھی گھر گھر وصولی کرتے تھے۔ حلوا اور حلیم بھی تیار کیا جاتا تھا جس پر شہدائے کربلا کی فاتحہ کی جاتی تھی اور ۱۰ر محرم کو میٹھی روٹی (جسے رُوٹ کہتے ہیں) پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فاتحہ ہوتی تھی۔

ایک دلچسپ مشغلہ ولی صاحب والا ہوتا تھا۔ یعنی ایک ڈنڈا قریب تین ہاتھ کا ہوتا تھا۔ اس کے اوپر کے سرے میں چاندی یا سونے کا ایک نعل لگا ہوا ہوتا تھا۔ (گویا شہداء کے گھوڑے کا نعل تھا)۔ پھر سواری آتی تھی یعنی ایک شخص اس ڈنڈے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا (اس ڈنڈے کو نیزہ کہتے تھے) سب لوگ یا علی یا علی کہتے تھے تو اس شخص پر حال آجاتا تھا اور وہ شخص شہداء کی سواری کہلایا جاتا تھا۔ اس کے نیزے میں تال کھانے اور پھولوں کے ہار باندھ دیے جاتے تھے۔ اس سواری کو ولی صاحب

بھی کہتے تھے جو لوگوں کی مرادیں پوری کرنے کے لیے نیزے کے ہار میں سے پھول وغیرہ توڑ کر دیدیتے تھے۔ دکن میں یا علی یا علی کے بجائے "ہائے دوست دولہا" کہتے تھے جس کے معنی وہی لوگ جانتے ہوں گے۔ پھر جب ولی صاحب مختلف مزارات کی زیارتوں سے فارغ ہو جاتے تھے تو ان کی سواری کو اتارنے کے لیے "نعرہ حیدری جا حسینؑ" کہتے تھے اور وہ ولی صاحب پھر سادہ انسان بن جاتے تھے۔ ولی صاحب. سواری کی حالت میں اپنی آنکھیں اوپر چڑھا لیتے تھے اور ان کا چہرہ خوفناک بن جاتا تھا۔ غالباً کچھ ارواح اچھی یا بری ان پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ کیونکہ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ وہ ولی صاحب فرمانے لگے کہ "اب برم (دیو) آتا ہے"۔ چنانچہ وہ ان کے قول کے مطابق آگیا۔ پھر ناریل پھوڑا گیا اور نیبو کاٹا گیا (خدا جانے کیوں؟)۔ یہ سب ولی صاحب (جن میں ہندو اور مسلمان بھی ہوتے تھے) ۷ر محرم کو تھوڑی دیر کے لیے آتے تھے۔ ۹ر محرم کو رات بھر گشت کرتے تھے اور ۱۰ر محرم کو تعزیوں کے ساتھ عصر کے بعد رانی تالاب کے کنارے رخصت ہو جاتے تھے۔ ۷ر محرم سے ۱۰ر محرم تک بعض عورتیں اپنے بچوں کو سبز رنگ کا کرتہ پہناتی تھیں اور لڑیوں کے ہار گلے میں ڈال دیتی تھیں جسے سیلی کہا جاتا تھا۔ ولی صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کہیں کہیں آگ کا الاؤ جلایا جاتا تھا۔ جب لکڑیاں جل چکتی تھیں تو ولی صاحب اور ان کے ساتھی اس پر سے گزرتے تھے۔ کہتے تھے کہ آگ نے کوئی اثر نہیں کیا۔ (اور اگر کیا بھی ہو تو صبر کرنا پڑتا ہوگا)۔ بہرحال لکھنے والے اور پڑھنے والوں کے لئے فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار ہی سے سبق لینا ہے۔

میرا امراؤتی کالج

علی گڑھ سے ۱۹۳۶ء میں فارغ ہو کر اپنے وطن جبل پور پہنچا۔ کئی ماہ تک بیکار رہا۔ گھر والے کبھی کہتے کہ وکالت کر لو، کبھی کہتے کہ فلاں افسر سے مل لو۔ مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند تھیں۔ ایک دن پریشانی کے عالم میں سو گیا تو علی الصباح جب آنکھ کھلی تو زبان پر برجستہ یہ آیت آئی: اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ۔ مجھے سکون حاصل ہوا اور یقین ہو گیا کہ اب جلد کوئی صحیح جگہ مل جائے گی۔ جالندھر سے بھائی عبدالحمید صاحب نے اخبار کا تراشہ بھیجا کہ پبلک سروس کمیشن نے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) کے لیے اُردو کے ایک استاد کی جگہ کے لیے اشتہار دیا ہے۔ میں نے کاغذات تیار کیے اور کمیشن کے دفتر کو روانہ کر دیے۔ کچھ عرصے کے بعد خط آیا کہ فلاں تاریخ کو ناگ پور (انٹرویو کے لیے) آجاؤ۔ میں اپنے معمول کے مطابق مُلّا بنا ہوا وہاں پہنچا۔ احباب نے کہا کہ آج تو سوٹ پہن لیتے۔ میں نے کہا میں نے کبھی سوٹ نہیں پہنا، آج پھر کیوں پہنوں؟ بہر حال انٹرویو کے لیے حاضر ہوا۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ علی گڑھ میں انگریزی بہت پڑھی تھی، انگریزی بولنے کی عادت تھی۔ دیر تک گفتگو رہی۔

انٹرویو والوں نے خاندان کے حالات بھی دریافت کیے اور ہر طرح سے اطمینان کیا۔ اور دیر تک بٹھایا۔ پھر میں رخصت ہوا تو دوسرے امیدواروں کو بلایا۔ وہ سوٹ میں تھے۔ چند روز کے بعد میری منظوری کا آرڈر پہنچا۔ میں اپنے ماموں مولانا عبدالمجید خان صاحب کے ساتھ امراؤتی پہنچا۔ وہاں اُن کے دوست مولانا محمود علی ندوی صاحب ایک اسکول میں عربی کے مدرس تھے۔ انھوں نے میرے لیے ایک مکان (کیمپ کے علاقے میں) دلوا دیا۔ کالج پہنچا تو پرنسپل TOSTEVIN - F-P تھا۔ وہ بہت اچھی طرح ملا۔ مجھے ٹائم ٹیبل دیا گیا تو اُس میں تدریس کے لیے ایسے گھنٹے بھی تھے کہ جن سے نماز جمعہ فوت ہو سکتی تھی۔ میں نے پرنسپل سے کہا کہ میں اُس وقت نہیں پڑھاؤں گا۔ اور اگر آپ نے مجبور کیا تو

ملازمت ہی ترک کر دوں گا۔ پرنسپل بہت شریف تھا، فوراً پورا ٹائم ٹیبل تبدیل کر دیا اور خوش ہوا۔

کنگ ایڈورڈ کالج میں زیادہ تر مرہٹہ طلبہ تھے۔ لڑکیاں بھی بہت تھیں۔ مسلمان طلبہ ہر سال ۴۰۔۴۵ ہوتے تھے۔ اُن کی شرافت سے پرنسپل بہت متأثر تھا، کیوں کہ دوسرے طلبہ ادب اور تمیز سے دور رہتے تھے۔ طلبہ عموماً ڈے اسکالر تھے۔ ایک ہوسٹل میں ہر مذہب کے طلبہ تھے۔ دوسرا ہوسٹل بھی تھا لیکن وہ خالی تھا۔ پرنسپل نے چاہا کہ مجھے اُس خالی ہوسٹل میں قیام کی سہولت فراہم کی جائے۔ لیکن ویسے بڑے ہوسٹل میں میرا تنہا رہنا بھی مجھے پسند نہیں تھا، اس لیے یہ ارادہ پھر ترک کر دیا گیا۔ مسلمان طلبہ جو ہوسٹل میں تھے اُن کے ساتھ مجھے نماز جمعہ ادا کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ دوسرے مسلمان اُستاد "میجر آغا سید حیدر حسن عابدی لکھنوی" تھے۔ نام کی طرح اُن کا قد بھی بڑا تھا اور اخلاق بھی بڑے تھے۔ C - T - U میں حصہ لیتے تھے۔ اور گو کہ فارسی کے استاد تھے لیکن اردو میں نظمیں اچھی لکھتے تھے۔ اُن کا تکیہ کلام تھا "اب سوال آن کر یہ ہے"۔

انگریزی کے اُستادوں میں مولان کر، شری واستو، جی ایل شُکلا، ٹوٹکنے، تری ویدی تھے، فلسفے میں ڈاکٹر جوالا پرشاد اور معاشیات میں ڈاکٹر ہرش چند سیٹھ تھے۔ سنسکرت میں سومل وار، مرہٹی میں کولتے، سائنس میں ڈاکٹر چکرورتی، مُکرجی اور جوگلے کر وغیرہ تھے۔ اور یہ سب لوگ مجھ سے بہت مانوس تھے۔ ڈاکٹر ہیرا لال جین، ہندی کے استاد تھے اور میرے بعض عزیزوں کے ہم وطن تھے، اس لیے زیادہ تعلق رکھتے تھے۔ علمی اور تحقیقی کاموں میں ڈاکٹر سیٹھ سب سے ممتاز تھے اور وہ ہمیشہ میری ہمت افزائی فرماتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے کہ یونی ورسٹی کے سالانہ جرنل میں ہر سال (دس سال تک) میرا مقالہ ضرور شایع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس جرنل کے ایڈیٹر تھے اور وہ ہر مقالے پر باہر کے کسی فاضل کی رائے ضرور لیتے تھے پھر اُسے بنگلور پریس سے حسنِ اہتمام کے ساتھ طبع کراتے تھے۔

اُستاذی پروفیسر ضیا احمد بدایونیؒ نے پی ایچ ڈی کے لیے میرا موضوع "سید حسن غزنوی" تجویز فرمایا تھا۔ میں نے اُس کی منظوری کے لیے یونی ورسٹی کو درخواست بھیجی۔ فیکلٹی کے اجلاس میں جب میری درخواست پیش ہوئی تو اُنہوں نے مخالفت کی لیکن سب نے (بلا انگریز ممبروں نے بھی) تائید کی۔ منظوری کے بعد رسمیہ طور پر ایک صاحب کو میرا گائیڈ مقرر کیا گیا۔ وہ ایسے تھے کہ شاید پوری عمر میں انھوں نے کوئی معمولی مضمون بھی نہ لکھا ہوگا۔ فیکلٹی والوں نے مجھ سے کہا کہ آپ درخواست دیں کہ مجھے گائیڈ سے مستثنیٰ کیا جائے۔ میں نے درخواست دی تو فوراً منظور ہوگئی اور اپنے لوگوں کو دوسری بار یہ زک پہنچی۔ یونی ورسٹی نے میرے لیے مزید یہ سہولت بہم پہنچائی کہ سید حسن غزنوی کے دیوان کا عکس انڈیا آفس لائبریری (لندن) اور BIBLIOTHEQUE NATIONALE DE PARIS سے بھی اپنے خرچ پر منگوا دیا۔ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے خاص فضل سے ہوا۔ مقالہ جب تیار ہوا تو اُس کے دو[2] حصے تھے۔ ایک حصہ اس شاعر کے متعلق تھا اور دوسرا حصہ اس کے ممدوح سلطان بہرام شاہ غزنوی کی تاریخ پر تھا۔ یعنی اُس کے تمام معاصرین کے کلام سے تاریخی شواہد پر مبنی تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے جو دو[2] ممتحن تھے تو اُن میں سے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے صرف سید حسن غزنوی والے حصے پر اپنی رائے بھیج دی اور اُستاذی ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے صرف تاریخ بہرام شاہ والے حصے کو ڈگری کے لیے کافی سمجھا تھا۔ بعد میں محض اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے مجھے ڈی لٹ کی ڈگری بھی تین کتابوں پر) حاصل ہوئی۔

امراؤتی کالج کے اساتذہ میں ایک خوبی یہ تھی کہ اُن میں سے اکثر و بیشتر کو غیبت سے سخت نفرت تھی۔ ایک استاد شاستری نے اپنی بیٹی کی صرف یہ تعریف کی تھی کہ وہ کبھی غیبت نہیں کرتی۔ ایک استاد جو عام معاشرے کے پروردہ تھے اور غیبت کو عار نہیں سمجھتے تھے اُن کے یہاں پروفیسر مولان کر کے ساتھ میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ صاحب خانہ نے کسی کی غیبت شروع کی تو ہم دونوں بالکل خاموش رہے۔ مولان کر جو لندن میں

شاعر MESSENGER پر کام کر کے آئے تھے بہت برافروختہ تھے۔ صاحب خانہ نے جب دیکھا کہ اُن کی غیبت میں کوئی شریک نہیں ہے تو موضوع بدل کر مولان کر سے پوچھنے لگے کہ اگر میں اپنے بیٹے کو لندن بھیج دوں تو کیسا رہے گا؟ انھوں نے برجستہ کہا کہ "ضرور بھیج دیں۔ کم از کم CULTURE تو سیکھ جائے گا۔"

امراؤتی کالج کا الحاق ناگ پور یونی ورسٹی سے تھا۔ وہاں امتحانات کی تاریخیں ہمیشہ کے لیے مقرر تھیں۔ یعنی مارچ کے پہلے دوشنبہ سے میٹرک کا امتحان شروع ہوتا تھا۔ دوسرے دوشنبہ سے انٹرمیڈیٹ کا، تیسرے دوشنبہ سے بی اے، بی ایس سی کا اور چوتھے دوشنبہ سے ایم اے، ایم ایس سی کا امتحان لازمی طور پر شروع ہوتا تھا۔ خواہ کوئی چھٹی ہو۔ فروری کے پورے مہینے کی چھٹی صرف فائنل والوں کے لیے مخصوص تھی۔ جون میں تمام امتحانات کے نتائج شائع ہو جاتے تھے اور جون کے آخری ہفتے میں مختلف کلاسوں کے لیے داخلے ہو جاتے تھے۔ پھر لازمی طور پہلی جولائی سے تعلیم شروع ہو جاتی تھی۔ ایسی سخت پابندی دوسری یونی ورسٹیوں میں نظر نہیں آئی۔

انگریز پرنسپل کے زمانے میں (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) کالج میں سخت نظم و ضبط تھا۔ یونی ورسٹی سے INSPECTION COMMITTEE آتی تو اُس کو غصہ آجاتا۔ وہ کہتا کہ MY CLERK WILL TAKE YOU ROUND THE COLLEG AND YOU MAY WRITE ANY THING YOU LIKE TO YOUR WONDERFUL UNIVERSITY.

اُسی زمانے میں (غالباً ۱۹۳۹ء میں) جامعہ اردو، آگرہ کے امتحانات (ادیب۔ ادیب ماہر۔ ادیب کامل) شروع ہوئے۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی اُس کے رجسٹرار بلکہ کرتا دھرتا تھے۔ حکومت نے اُس وقت اُن امتحانات کو باقاعدہ تسلیم نہیں کیا تھا، لیکن ان کا معیار بہت اچھا تھا۔ فاروقی صاحب نے مجھے لکھا کہ اپنے کالج کے طلبہ کو ان امتحانات کے لیے آمادہ کرو۔ میں نے پرنسپل سے عرض کیا کہ یہ امتحانات محض ادبی ہیں اور ان سے

ہمارے طلبہ کو بہت فائدہ ہوگا۔ پرنسپل نے بخوشی منظوری دیدی۔ پھر میں نے نہ صرف کالج کے طلبہ کو بلکہ شہر کے بہت سے طلبہ و طالبات کو تیار کیا۔ شہر میں غالباً تین دن اُن سب کو پڑھاتا تھا۔ شہر کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ جب امتحانات ہوتے تو ہمارے طلبہ ملک کے دوسرے مرکزوں کے طلبہ کے مقابلے میں زیادہ نمبر حاصل کرتے۔ اس طرح وہ یونی ورسٹی کے امتحانوں میں بھی امتیازی نمبر حاصل کرتے تھے۔ یوں بھی ہمارے طلبہ اپنے بزرگوں کے ماحول کے پروردہ تھے اور بہت امتیازی شان رکھتے تھے۔

انگریز پرنسپل کے بعد ڈاکٹر شبدے پرنسپل ہوئے۔ وہ ریاضیات کے پروفیسر تھے۔ مزاج میں بڑی شرافت تھی۔ وہ جب کسی اُستاد کو دفتر میں بلانا چاہتے تھے تو صرف اتنا کہلاتے کہ "شبدے آپ کو سلام کہتا ہے"۔ طلبہ کا کوئی بے جا شور غل سُنتے تو کہتے کہ "آپ کو یہ بات زیب نہیں دیتی"۔ وہ پرنسپل چلے گئے تو پھر ایک "عجیب" شخص آئے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر کرشنا مورتی آئے۔ وہ بھی نہایت شریف اور سلیم الطبع تھے۔ سب سے خود بڑھ کر ملتے تھے، کبھی میرے غریب خانے پر بھی آجاتے تھے۔

طلبہ میں سب سے زیادہ ممتاز جناب محمد متین صدیقی تھے۔ وہ پہلے بھی اور اب بھی اپنے خلوص اور شرافت میں اپنا جواب نہیں رکھتے، مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ سردی کے زمانے میں کسی کو ٹھٹھرتا ہوا دیکھتے تو اپنا سویٹر اُسے پہنا دیتے اور صرف اپنے کوٹ میں گزارہ کر لیتے۔ کسی کو اپنا لحاف دیدیتے۔ اپنے ساتھیوں کی اصلاح اور فلاح کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ طلبہ اُن کو "رفاہِ عام" کہا کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے اپنے کئی عزیزوں کو اپنے پاس رکھا، اُن کو پڑھایا لکھایا اور ہر طرح اُن کی مدد کی۔ بڑے افسر بننے کے بعد بھی پیوند لگا ہوا کوٹ پہنتے تھے۔ انگریزی ادب سے اُن کو شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ SHELLEY اور KEATS اُن کے محبوب شاعر تھے اور اب بھی اُن کی ذاتی لائبریری میں انگریزی ادب کی بکثرت کتابیں موجود ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ (TEST کے امتحان میں) انھوں نے تین گھنٹوں میں صرف SHELLEY پر ایک سوال حل کیا تھا اور ان کے اُستاد مولان کرشن

کرتے تھے (۱)

کالج کے ممتاز طلبہ خود محمد متین صدیقی کے چھوٹے بھائی محمد مبین صدیقی، ڈاکٹر نعیم الدین، نذیر محمد، منظور الامین اور ان کے بھائی محمد متین، تکریم داد خان (کرنل) اور ان کے بھائی، مظفر علی، عبدالشکور اور اُن کے بھائی، فخر الدین، عبدالنعیم خان، ظہیر الدین سعید قادری، عزیز صدیقی، اصغر علی، بشیر اللہ خان اور اُن کے بھائی سلیم اللہ خاں اور رفعت اللہ خاں، محمد علی، محسن علی، فیروز بھائی، حبیب خان، موسٰی کلیم اللہ، شجاعت علی عشرت وغیرہ اب بھی بہت یاد آتے ہیں۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہر امراؤتی کا کچھ جغرافیہ بھی عرض کر دوں۔ یہ شہر صوبہ برار کا صدر مقام تھا۔ پہلے وہ نظام حیدرآباد (دکن) ریاست میں شامل تھا، پھر انگریزوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہر پناہ کے اندر آباد تھا۔ آبادی بڑھی تو دور دور تک شہر کی وسعت ہوگئی۔ ریلوے اسٹیشن چھوٹا سا تھا، کیوں کہ ریلوے کی مین لائن ۲ میل پر بدنیرہ سے گزرتی تھی۔ شہر سے دو میل شمال کی طرف کنگ ایڈورڈ کالج کی خوبصورت عمارت ہے جو سیاہ پتھر سے تعمیر ہوئی ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک فرلانگ پر مشرق کی طرف ایک خوبصورت اور شاندار مسجد ہے۔ اُس کے مشرق میں اسکول کا ہوسٹل، پھر کھیل کا میدان اور محمڈن ہائی اسکول ہے جو خواجہ لطیف احمد پانی پتی مرحوم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُس کے مشرق میں ایک پہاڑی ہے جس کا نام مال ٹیکری ہے۔ اس پر ایک بزرگ کا مزار ہے۔ اب وہاں شیواجی کا مجسمہ بنا دیا گیا ہے۔ اُس کے مشرق میں کیمپ کا علاقہ ہے۔ جہاں

---

(۱) محمد متین صدیقی کے الد سید لی بجوری حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (محاسن کلام غالب کے مصنف) پروفیسر محمد تسنیم صدیقی، ڈاکٹر ریاض الاسلام، ڈاکٹر ظل الرحمٰن، نہال سیوہاری سب اسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ناگ پور یونی ورسٹی کے ایک طالب علم تراب رضوی کو پی ایچ ڈی کے لیے مولانا حسرت موہانی نے "اُردو شاعری کا تاریخی اور سیاسی پس منظر" موضوع دیا تھا۔ یہ طالب علم پاکستان بننے پر کراچی آگئے لیکن مصروفیات کی وجہ سے کام نہ کر سکے۔ پھر میں نے یہ موضوع ثروت یاسین کو دیا۔ وہ کچھ کام کر چکی تھیں کہ لندن چلی گئیں پھر کراچی، سندھ، پنجاب اور ڈھاکا کی یونی ورسٹیوں میں اس موضوع پر کام ہوا۔

راقم الحروف کا قیام تھا۔ پہلے خان بہادر عبدالقادر صاحب کے مکان میں، پھر دوسرے دو مکان میں قیام رہا۔ وہاں سے قریب آدھے میل پر بڑا گی تالاب ہے جس سے کیمپ کے علاقے کو بہت صاف پانی ملتا ہے۔ اُس کے قریب گھنے جنگل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ کیمپ کے علاقے میں ہر جمعہ کو عصر کے بعد قرآن خوانی اور مغرب کے بعد تفسیر عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ پہلے میرے مکان میں یہ اہتمام ہوتا تھا اور میری اہلیہ مرحومہ اس کے بعد سب کے کھانے کا انتظام کرتی تھیں۔ پھر یہ سلسلہ دوسرے حضرات کے یہاں ہونے لگا اور اب بھی جاری ہے۔ اس کی برکت سے وہاں کے تمام وبائی امراض ختم ہو گئے۔

شہر کے علاقے میں بھی ادبی فضا قائم تھی۔ حکیم عبدالاحد برہم بھوپالی، وکیل عبدالمنان صاحب، وکیل ہدایت علی صاحب، وکیل شرف الدین صاحب وغیرہ کو شعروادب سے دلچسپی تھی۔ شہر سے شمال مغرب کی طرف (قریب ۳۰ میل پر) ایلچپور، شرفاء کی بستی ہے۔ وہاں شاہ دولہا عبدالرحمٰن علیہ الرحمہ کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔ ایلچپور اور اُس کے نواح میں نکھاڑی کا تیل بہت تیز خوشبو کا ہوتا ہے۔ جو لندن میں CENT میں کے کام آتا ہے۔ وہاں کا پورا علاقہ بہت پر فضا اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

میرا اردو کالج

ناگ پور یونی ورسٹی سے ملحقہ کالجوں میں قریب گیارہ سال گزارنے کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء میں کراچی آنا پڑا۔ اپنے دیرینہ بزرگ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم (م ۱۹۷۲ء) کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دی تو انھوں نے (الٰہ آباد سے) لکھا کہ "تم واپس اپنی یونی ورسٹی آجاؤ۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب بھی یہی فرماتے ہیں۔ وہ تم کو دعا کہتے ہیں۔ آجکل وہ میرے پاس آئے ہوئے ہیں"۔ ایسی شفقت کا دل پر بہت اثر ہوا۔ لیکن میں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکا اور کراچی ہی میں رہنا پڑا۔ چند ماہ کے بعد ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مرحوم کی کوششوں سے اور عبدالمجید قریشی صاحب کی ہمت سے اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب اس کالج کے سرپرست ہوئے۔ میں نے درخواست دی تو میرا تقرر ہو گیا۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اور ڈاکٹر عبدالمجید قریشی صاحب کالج کو سنبھال رہے تھے۔ اچھے اساتذہ بھی محنت سے کام کر رہے تھے لیکن قریب ۲ سال کے بعد ان دونوں میں ناچاقی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اساتذہ سے اسٹرائیک کرا دیا۔ اور ہر دوسرے تیسرے دن وہ ایک خط قریشی صاحب کے لیے تیار کراتے تھے اور اُس پر تمام اساتذہ کے دستخط کراتے تھے۔ میں بھی دستخط کر دیتا تھا لیکن ایسے خط کو پڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میرے کرم فرما اکرام الرحمٰن مرحوم (جو جغرافیہ کے استاد تھے) میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ کیا آپ نے بھی استعفاء دے دیا ہے؟۔ میں نے کہا نہیں، میں نے استعفاء نہیں دیا۔ فرمانے لگے کہ فلاں خط پر آپ کے دستخط موجود ہیں (یعنی استعفاء والے خط پر)۔ میں نے کہا میں نے تو وہ خط پڑھا نہیں تھا۔ بے شک میری غفلت تھی لیکن غالباً اللہ تعالیٰ کی یہی مصلحت

ہوگی۔ اکرام الرحمٰن صاحب نے میری بات عبدالمجید قریشی صاحب کو بتائی۔ وہ بے چارے میرے مکان (۳۲۸۔ پیر الٰہی بخش کالونی) تشریف لائے۔ لیکن میں اُس وقت موجود نہیں تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اردو کالج سنہ ۱۹۵۰ء میں قائم کیا اور مختلف مضامین کے اُستادوں کا تقرر کرنا چاہا، تو میں نے بھی درخواست بھیج دی۔

اسلامیہ کالج نیا نیا قائم ہُوا تھا۔ لیکن اس میں بعض ایسے اساتذہ بھی آ گئے تھے جو ایس ایم کالج میں تھے۔ یا ہندوستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں بھی رہ چکے تھے۔ وہاں کے بعض طلبہ بھی بعد میں اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری، ڈاکٹر معین الدین بقائی، ریاض شفیع، ڈاکٹر سلیمان حامد، عبداللہ ہلال، سلیم احمد مرحوم، نجم الثاقب وغیرہ۔

لیکن ان طلبہ میں سے ایک بہت زیادہ ممتاز ہوئے، یعنی چیف جسٹس ہوئے اور تین مرتبہ قائم مقام گورنر ہوئے، اُن کی محبت اور خلوص کا ایک واقعہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں جب کہ اسلامیہ کالج سے استعفا دینے والوں میں میرا نام بھی تھا، تو وہ ایک دن میرے پاس آئے اور تنہائی میں ایک رقم دینے لگے اور قبول کرنے پر اصرار کرنے لگے کہ آپ کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کے لیے خرچ کی ضرورت ہو گی۔ میں اُن کی اعلیٰ شرافت اور انتہائی خلوص سے بے حد متاثر ہُوا، رقم تو میں نے قبول نہیں کی لیکن بارگاہِ الٰہی میں اُن کے لیے بہت زیادہ دعا کرتا رہا اور اب بھی کرتا ہوں۔

اتنی لمبی تمہید کے بعد اب اردو کالج سے متعلق عرض کرتا ہوں۔ ہُوا یہ کہ اکرام الرحمٰن مرحوم نے بغیر مجھے بتائے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے میرا ذکر کر دیا کہ وہ اب اسلامیہ کالج سے فارغ ہیں اور آپ کے کالج میں آنے کے لیے درخواست بھی دے چکے ہیں۔ مجھ پر ان کی دیرینہ شفقت تھی۔ انٹرویو بورڈ میں بہت سے بڑے بڑے لوگ تھے۔ مجھے بُلوایا تو پرنسپل محی الدین صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ شعبۂ فارسی اور شعبۂ

اردو دونوں کے صدر کی جگہ خالی ہے، آپ کون سی جگہ لینا چاہتے ہیں۔ عبدالحق صاحب فوراً بول اُٹھے کہ ان کو شعبۂ اردو کے صدر کی جگہ پر لیا جائے۔ میں شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔

پرنسپل محی الدین صاحب کے بھائی سید تقی الدین صاحب اس کالج کے سیکرٹری تھے۔ اُن سے مجھے اپنے تقرر کے دو تین دن بعد ملنے کا اتفاق ہُوا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے حبیب اللہ خان غضنفر صاحب کو انٹرویو کے لیے نہیں بُلوایا۔ فرمانے لگے کہ کون؟ میں نے پھر پورا نام دہرایا۔ فرمانے لگے کہ میں کچھ اور سمجھا تھا۔ بہرحال تقی الدین صاحب نے فوراً اُن کا تقرر کر دیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ بڑے فاضل شخص تھے۔ اور اردو کالج کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہاں بعض بڑے بڑے اُستاد بھی آ گئے تھے۔ مثلاً سید ولی محمد صاحب جو علی گڑھ کے انٹرمیڈیٹ کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ اور ہم میں سے بہت لوگوں کے استاد رہ چکے تھے، وہ بھی اردو کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر معین الحق صاحب تاریخ کے لیے اور ڈاکٹر غلام سرور صاحب فارسی کے لیے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ جلیل الدین صاحب محمد حسین سلیمانی صاحب، عبدالرشید فاضل صاحب، عبدالعزیز صاحب، عبدالسلام صاحب، مولا منتخب الحق صاحب وغیرہ سبھی حضرات استاد کی حیثیت سے بہت کامیاب تھے۔ اسی وجہ سے اس کالج کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور بکثرت طلبہ نے داخلہ لیا۔ پھر کامرس کالج بھی اسی کے ساتھ قائم کر دیا گیا تو مزید شہرت ہوئی۔ یہاں تک ہُوا کہ بعض اساتذہ کی کلاسوں میں شہر کے دوسرے کالجوں کے طلبہ بھی شرکت کرتے تھے اور بعض ایسے اساتذہ بھی تھے جو اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے مضامین بھی پڑھا دیتے تھے! اس طرح محبت اور الفت کا عجیب ماحول بن گیا تھا۔

کالج شروع ہُوا تو طلبہ کی کثرت کی وجہ سے بعض طلبہ میں کچھ غلط قسم کا جوش بھی پیدا ہُوا اور انھوں نے اپنے دو استادوں سے کچھ گستاخانہ بات کی۔ ان استادوں نے پرنسپل سے شکایت کی اور انھوں نے ان میں سے کچھ طلبہ کا اخراج RUSTICATION

بتائے ہوئے) بعض اساتذہ نے یونی ورسٹی کو شکایت نامہ لکھ بھیجا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ یونی ورسٹی کے بعض حضرات ہمارے کالج میں آئے ہوئے ہیں اور خاص خاص اساتذہ سے بیانات لے رہے ہیں۔ پھر اُنھوں نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہ کیا آپ کو بھی کالج کے اربابِ حل وعقد سے کوئی شکایت ہے؟ میں نے کہا کہ کالج ہمارا ہے اور طلبہ بھی ہمارے ہیں۔ پھر کس سے اور کس لیے شکایت ہوسکتی ہے؟۔ وہ حضرات خاموش ہو گئے اور شکایات کا دفتر بھی بند ہوگیا۔

اسلامیہ کالج کی طرح اردو کالج میں بھی شروع ہی سے مختلف مضامین میں ایم اے کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔ یونی ورسٹی میں ۱۹۵۵ء تک ایم اے وغیرہ کی تعلیم کا کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ عارضی طور پر اردو کالج کے اساتذہ کے تعاون سے ایم اے کے چند مضامین کی تعلیم شروع کرائی گئی تھی۔ شکر ہے کہ بعض طلبہ ایم اے میں بھی نمایاں حیثیت سے کامیاب ہوئے تھے اور بعد میں بھی وہ نامور ثابت ہوئے۔ مثلاً ابنِ انشا مرحوم، ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی مرحوم وغیرہ۔ ان سب کی تصانیف سے علم و ادب کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور وہ سب مجھے بہت عزیز ہیں ①۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کی بدیہہ گوئی کا ایک واقعہ بار بار یاد آتا ہے۔ وہ یہ کہ ایم اے کے زبانی امتحان کے موقع پر ایک صاحب میرے ساتھ ممتحن تھے۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ یہ (اسلم فرخی) میرے بہترین شاگرد ہیں۔ آپ جو سوال چاہیں دریافت فرمائیں۔ انھوں نے ایک لفظ کے موجودہ اور اصلی معنی دریافت کیے اور

---

① ۱۹۶۷ء میں PIIF کانفرنس اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ دنیا کے اسکالر جمع تھے۔ جرمنی کے ایک فاضل نے NIETZSCHE پر مقالہ پڑھا۔ میرے ایک پرانے شاگرد اگلی صف میں تھے۔ وہ کھڑے ہو کر کہنے لگے آپ سے زیادہ اس فلسفی کے متعلق مجھے میرے اُستاد ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان نے پڑھایا ہے۔ میں چونک پڑا اور شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں۔

کر دیا۔ میں کالج پہنچا تو اُن طلبہ کے اخراج والا نوٹس دیکھا۔ مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میں سیدھا پرنسپل صاحب کے پاس پہنچا اور عرض کیا کہ آپ نے اپنے بچوں بیٹوں کا اخراج کیا اور کیا آپ کو تکلیف نہیں ہوئی؟۔ فرمانے لگے کہ ان میں سے دو تین طلبہ واقعی صحیح نہیں ہیں اور میں اُن کو حیدر آباد (دکن) سے جانتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ ممکن ہے کہ وہ پہلے ایسے رہے ہوں لیکن اب تو ایسے نہیں ہیں اور میری کلاس میں وہ تو بہت مؤدب رہتے ہیں۔ فرمانے لگے اچھا آپ اُن استادوں سے ملیں جنھوں نے ان طلبہ کے لیے ایسی سزا تجویز کی ہے۔ میں فوراً اُن استادوں کے پاس گیا اور بات کی۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کو تو سب کے ساتھ ہمدردی ہے، وہ طلبہ بہت نالائق ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ نالائق بھی تو آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ کیا آپ کو پسند ہے کہ آپ اپنے چھوٹے بھائیوں کا کیریر خراب کریں؟۔ پھر میں نے کہا کہ اگر میں ان سے تحریری معافی نامہ لکھوا دوں تو کیا آپ لوگ معاف کر دیں گے؟۔ وہ کہنے لگے کہ وہ طلبہ ہرگز معافی نامہ نہیں لکھیں گے، وہ نہایت بدتمیز ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس کام کا ذمہ لیتا ہوں اور ابھی معافی نامے لکھوا کر لاتا ہوں۔ چناں چہ اُن طلبہ کو میں نے بُلوایا اور ان سب سے تحریری معافی نامے (دستخط کے ساتھ) تیار کرائے، پھر میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ میں آپ سب پر دس دس روپے جُرمانہ بھی کرتا ہوں۔ وہ طلبہ راضی ہو گئے۔ میں نے معافی نامے پرنسپل صاحب کو پیش کر دیے۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے اُن سب پر ایسا جُرمانہ کر دیا ہے اور وہ ضرور ادا کریں گے۔ پرنسپل صاحب نے اخراج کا نوٹس واپس لے لیا۔ کالج میں دھوم مچ گئی اور تمام طلبہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بہرحال کالج اچھی طرح چلنے لگا اور طلبہ میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہوا۔ چناں چہ اس کالج کے نتائج بہترین نکلنے لگے

ایک مرتبہ ایک استاد میرے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ دیکھیے فلاں استاد کی تنخواہ بڑھا دی گئی۔ میں نے کہا کہ بھائی میری تنخواہ تو کم نہیں کی گئی، اُن کو شاید زیادہ کی ضرورت ہوگی۔

تنخواہوں میں ایسے اضافوں کی وجہ سے یا دوسرے مسائل کی خاطر (بغیر مجھے

مثال کے لیے کسی شعر کی فرمائش کی۔ اسلم فرخی صاحب نے فوراً اُس لفظ کے معنی بتادیے اور برجستہ ایک شعر بھی موزوں کر دیا۔ ممتحن صاحب حیرت میں خاموش ہوکر رہ گئے۔

ایک گناہ آمیز لطیفہ بھی سُنادوں۔ ایم اے (اردو) کے زبانی امتحان میں کبھی کبھی ڈاکٹر عبدالحق صاحب ساتھ ہوتے تھے۔ بعض طلبہ کے لیے وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ ان کو ۳۳ نمبر دیدو۔ نمبروں کی فہرست میں دستخط کرتے وقت بھی دریافت فرماتے تھے کہ ان کو ۳۳ نمبر دیدیے؟۔ میں عرض کرتا کہ بے شک دیدیے ہیں۔ لیکن ۳۳ نمبر اپنی طرف سے بھی شامل کر دیا کرتا تھا تاکہ اُن کا ڈویژن بہتر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ آمین۔

ع بزرگاں خوردہ برخورداں نہ گیرند

میری ڈائری کے چند اوراق

علی گڑھ سے آگرہ کئی مرتبہ ریل سے جاچکا تھا۔ اب خیال ہُوا کہ سائیکل پر جاؤں۔ ممتاز علی اور صالح بھائی کو ساتھ لے کر ۹ نومبر ۱۹۳۵ء کو ½ ۱۱ بجے رات ہم لوگ روانہ ہوئے۔ ۵۳ میل کا سفر طے کر کے علی الصباح آگرہ پہنچے۔ اعتماد الدولہ کے مزار کے قریب مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ بمبئی ستارہ ہوٹل کے کمرے میں قیام کیا۔ ½ ۲ بجے سکندرہ گئے۔ رات کو تاج محل دیکھا۔ دوسرے دن صبح کو فتح پور سیکری گئے۔ واپس ہوکر آگرہ سے پھر رات کو روانہ ہوئے اور ۱۲ نومبر کو علی الصباح علی گڑھ آ گئے۔

---

۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو سہسرام (بہار) کے ایک نوجوان سید شاہ سبحان احمد علی گڑھ سے گزر رہے تھے۔ وہ رات کو ہر پانچ قدم پر دُو رکعت نفل ادا کرتے ہوئے حج کو جارہے تھے۔ دن کو آرام کرتے تھے۔ بھائی عبدالحمید جالندھری کے ساتھ اُن سے ملنے کے لیے راقم الحروف گیا۔ انھوں نے میری ڈائری پر یہ مصرع لکھدیا:۔

ع جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

سہ شنبہ ۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء کو مصر کے سلطان فواد کا انتقال ہوا۔ وہ مصر کے انگریزوں کو نکالنا چاہتے تھے۔ دین کے حامی تھے۔

علی گڑھ سے وطن کو رخصت ہونے لگا تو یکم مئی ۱۹۳۶ء کو قاری ضیاء الدین احمد صاحب رح نے میری ڈائری پر یہ نصیحت لکھ دی:۔

بعد حمد و صلوٰۃ، احقر ضیاء الدین احمد غفرلہٗ عرض کرتا ہے کہ اللہ پاک سے ہمیشہ

ڈرتے رہیں اور اُس کے احکام دل و جان سے بجالاتے رہیں ـــــ اور اُس سے ہمیشہ اچھی امید رکھیں ـ فقط ـ

۳ر جون سنہ ۱۹۳۶ء کو ایم اے (اردو) اور ایل ایل بی کا نتیجہ شایع ہوا ۔

۱۴ر جون سنہ ۱۹۳۶ء کو ایم اے (فارسی) کے استاد لفٹننٹ حاجی حمید الدین صاحب نے لکھا کہ تم وکالت کرو، اور سیاست میں حصہ لو ۔

۱۶ر جون سنہ ۱۹۳۶ء کو میں اپنے بچپن کے دوست ڈاکٹر سید محمد سعید کے ساتھ منڈلہ گیا۔ وہاں میری ہمشیر صاحبہ رہتی تھیں ۔

۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۳۶ء کو پردادی سکینہ صاحبہ کی خواب میں زیارت ہوئی ۔

۲۶ر ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء کو جبل پور میں ہمشیر صاحبہ کے خُسر باقر علی صاحب کا انتقال ہوا۔

۱۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء (چہارشنبہ ۲۷ رجب سنہ ۱۳۵۵ھ) کو قبلہ ماموں عبدالمجید خان صاحب کے یہاں میری شادی ہوئی ۔

بڑے بھائی نذیر احمد خان نے پہلا حج غالباً سنہ ۱۹۳۱ء میں کیا تھا اور دوسرا حج والدہ صاحبہ کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں کیا تھا ۔

شب دوشنبہ ۲۵ر جنوری سنہ ۱۹۳۷ء کو قبلہ بھائی اکرام حسین صاحب کی اہلیہ صاحبہ (مکرم حسین کی والدہ) کا جبل پور میں انتقال ہوا ۔

۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۳۷ء کو پبلک سروس کمیشن نے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں مجھے اردو کا استاد مقرر کیا ـــــ

۱۵ر مئی سنہ ۱۹۳۸ء کو علی گڑھ گیا۔ پھر ۲۱ر مئی کو بھائی عبدالحمید صاحب (محمّد سیدکبیر) سے ملنے جالندھر گیا۔ راستے میں سرہند شریف کے اسٹیشن پر میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ جی چاہتا تھا کہ ڈبے میں سے چھلانگ لگاکر مجددِ الفِ ثانی قدس سرہٗ کے مزار شریف پر پہنچ جاؤں۔ واپسی میں علی گڑھ ہوتا ہوا ۲ر جون کو جبل پور پہنچا۔

۱۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء کو جبل پور سے روانہ ہوکر علی گڑھ ہوتا ہوا چھترا کے راستے سے حبیب گنج پہنچا۔ وہاں نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی صاحب کا کتب خانہ دیکھا۔ چار دن کے بعد بریلی پہنچا۔ وہاں سید محمد صاحب کے یہاں ایک دن رہ کر رام پور گیا۔ مولانا امتیاز علی عرشی صاحب کے یہاں تین دن قیام کیا اور نواب صاحب کا کتب خانہ دیکھا۔

قبلہ والدہ صاحبہ، بڑے بھائی صاحب، بڑی بھاوج صاحبہ اور اُن کا بچہ محمود علی امراؤتی سے ۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء کو حج کے لیے روانہ ہوئے۔ (بھائی صاحب کا یہ تیسرا حج تھا۔ بعد میں پاکستان میں مزید ۲ حج کیے) ـــــ

چہارشنبہ ۱۹-اپریل سنہ ۱۹۳۹ء (۲۸ صفر سنہ ۱۳۵۸ھ) کو ہمارے چچا اکبر خان صاحب کا پناگر (جبل پور) میں انتقال ہوا۔ ـــــ

۲۵ر اپریل سنہ ۱۹۳۹ء کو بچپن کے دوست ڈاکٹر سید محمد سعید کے ساتھ حیدر آباد (دکن) گیا۔ وہاں آصفیہ لائبریری۔ یونی ورسٹی لائبریری اور دفتر دیوانی و مال کا کتب خانہ دیکھا۔ نواب فصاحت یار جنگ جلیل سے بھی ملاقات کی۔ وہیں میرے استاد بھائی قاری ابرار احمد صاحب (عرف اظہر) سے ملاقاتیں رہیں۔ محلّہ سلطان پورہ میں تھے

۳۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء کو الٰہ آباد گیا اور محترم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۲۲-الف- میور روڈ) کے یہاں قیام کیا۔ دوسرے دن پٹنہ گیا اور وہاں خدا بخش لائبریری میں ایک ہفتہ

مطالعہ کیا۔ بمبئی سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ مولانا مسعود عالم ندوی صاحب نے اُن کے ساتھ مجھے بھی اِفطار میں مدعو کیا۔

---

۲۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی گیا۔ اور ایک ہفتہ قیام کیا۔ جامع مسجد لائبریری، کاما پارسی لائبریری اور یونی ورسٹی لائبریری دیکھی۔ جامع مسجد لائبریری میں فارسی کے مخطوطات بھی ہیں۔ ولی کا اور درد دیوان بھی ہے جس میں اُن کی وفات سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ ہے جس سے ۱۱۱۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ اردو مخطوطات خاصی تعداد میں ہیں۔ کاما پارسی لائبریری میں قدیم فارسی مخطوطات بہت ہیں۔

---

۸ مئی ۱۹۴۰ء کو جبل پور سے ستنا گیا۔ تین گھنٹے لگے۔ کرایہ ڈھائی روپیہ تھا۔ وہاں سے ۳۱ میل پر ریواں ریاست ہے۔ بس میں چار گھنٹے لگے۔ پروفیسر اختر حسین نظامی صاحب کے یہاں تین دن قیام کیا۔ وہاں مولانا رحمٰن علی مرحوم (تذکرہ علمائے ہند کے مصنف) کا کتب خانہ دیکھا۔ وہاں مولانا شبلی کا ایک نایاب مکتوب ملا۔ رنگین کی مثنویاں بھی تھیں۔ وہاں سے واپس ستنا آیا اور الٰہ آباد ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ وہاں ندوۃ العلما (دارالعلوم) کے مہمان خانے میں بہت آرام سے قیام کیا۔ وہاں کا کتب خانہ دیکھا اور یونی ورسٹی لائبریری بھی دیکھی۔ وہاں کچھ زیادہ کارآمد مخطوطات نہیں تھے۔ امیر الدولہ پبلک لائبریری میں بھی مخطوطات کم تھے۔ پھر میرے بڑے ماموں مولانا عبدالمجید خان صاحب کے دوست مولانا محمود علی خان صاحب کے بھائی مولوی غفور محمد صاحب سے ملاقات کی۔ وہ قندھاری بازار کی سعادت منزل میں رہتے تھے (بعد میں کراچی آ گئے تھے)۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب (دین دیال روڈ متصل وکٹوریہ روڈ) کا کتب خانہ بھی دیکھا۔ ان کے پاس اچھا ذخیرہ تھا۔ ۱۵ مئی کو لکھنؤ سے ۹ میل کے فاصلے پر کاکوری گیا۔ خانقاہِ قلندریہ کا کتب خانہ دیکھا۔ وہاں مطبوعات ہیں۔ خانقاہ میں ہر موسم میں اور ہر وقت ماش کی دال اور روٹی سے تواضع ہوتی ہے۔ وہاں سے اسی شب لکھنؤ آیا اور الٰہ آباد ہوتا ہوا ۱۷ مئی کو جبل پور پہنچا۔

---

۲۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کو امراؤتی سے بھوپال روانہ ہوا۔ وہاں ارشاد حسین صاحب اور اُن کے بھانجے ظفر الدین صاحب کے یہاں محلہ شاہ جہاں آباد میں قیام کیا۔ حمیدیہ لائبریری میں قلمی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ بعض مخطوطات بہت اہم ہیں۔ انتخاب دواوین شعرائے متقدمین (نمبر ۲) اچھا مخطوطہ ہے۔ بھوپال کے پیر دروازہ میں ایک ضعیف العمر بزرگ کے پاس مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ ولی کا ایک قلمی دیوان اور افضل کی بکٹ کہانی (بارہ ماسا) خریدی۔ وہاں سے یکم اکتوبر کو واپس ہوا اور کھنڈوا میں مقبول حسن نیازی صاحب (املی پورہ) کے یہاں رات کو قیام کیا اور دوسرے دن اُن کے ساتھ برہان پور گیا۔ وہاں محلہ اتوارا میں مولانا سید مطیع اللہ راشد صاحب کے یہاں قلمی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر رات کی گاڑی سے بھساول ہوتا ہوا ۳ اکتوبر کو امراؤتی واپس پہنچا۔

---

۲۶ دسمبر ۱۹۴۰ء کو امراؤتی سے بمبئی کو روانہ ہوا۔ کاما لائبریری ۲۷ دسمبر کو دیکھی۔ دوسرے دن وہاں سے پونا گیا۔ وہاں ۹ بجے رات کو کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس کا افتتاح بمبئی کے گورنر نے کیا۔ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صاحب نے مجھے اپنے پاس کیمپ کے علاقے میں (بنگلہ نمبر ۱۰۸۔ کورے گاؤں پارک) ٹھہرایا۔ میرے لیے وہ دو قلمی کتابیں حبیب گنج سے لے کر آئے تھے۔ اس کانفرنس میں بنگال کے فضل الحق۔ اور حیدرآباد (دکن) کے نواب کمال یار جنگ اور بہادر یار جنگ وغیرہ نے شرکت کی۔ میں نے بھی ایک مقالہ پڑھا۔

بھائی عبدالحمید صاحب کابل سے جالندھر آئے۔ پھر فروری ۱۹۴۱ء کے آخری ہفتے میں امراؤتی آئے۔ ۲۸ فروری کو میری ڈائری میں رومی کا یہ شعر لکھا ہے

مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من   پیشِ عاشق ایں بود حب الوطن

چہارشنبہ ۲۳ اپریل ۱۹۴۱ء کو جبل پور سے اٹارسی پہنچا۔ وہاں بھائی عبدالحمید صاحب ناگ پور یونی ورسٹی کے ایم اے (فارسی) کے امتحان سے فارغ ہو کر پہنچے تھے۔ مل گئے۔

اُن کے ساتھ دہلی آیا۔ وہ دوسری گاڑی سے جالندھر چلے گئے۔ میں سیدھا لاہور (براہ بھٹنڈا) ۲۴ راپریل کو پہنچا۔ جبل پور سے اٹارسی، دہلی، بھٹنڈا کے راستے سے لاہور کا فاصلہ ۹۴۸ میل ہے۔ ۱۶ روپے ۳ آنے کرایہ تھا۔ لاہور میں نیلا گنبد کے قریب نور محل ہوٹل میں قیام کیا۔ پرنسپل محمد شفیع صاحب، ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اور پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب سے ملاقات کی۔ شیرانی صاحب کے مکان پر نادر سکے اور مخطوطات دیکھے۔ ۲۵ راپریل کو بھائی عبدالحمید صاحب کابل جانے کے لیے لاہور سے گزرے۔ اُن سے ملاقات کی۔ لاہور میں پبلک لائبریری کے مخطوطات بھی دیکھے۔ ۲۸ راپریل کو لاہور سے جالندھر گیا۔ اسی شام کو دہلی روانہ ہوا۔ وہاں سے علی گڑھ گیا۔ پھر ۳۰۔ اپریل کو دوسری بار حبیب گنج گیا۔ نواب صدر یار جنگ حسب معمول بہت شفقت سے پیش آئے۔ یکم مئی کو وہاں سے علی گڑھ واپس اور دو دن وہاں سے جبل پور کے لیے روانہ ہوا۔

عجیب اتفاق ہے کہ علی گڑھ کے چار بزرگ تھوڑے وقفے سے اللہ کو پیارے ہوئے۔ (۱) مولانا سلیمان اشرف صاحب۔ سہ شنبہ ۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۸ھ (۲۵ راپریل سنہ ۱۹۳۹ء) (۲) مولانا احسن مارہروی صاحب۔ پیٹھ میں سرطان ہوگیا تھا۔ جمعہ ۷ رجب سنہ ۱۳۵۹ھ (۳۰ راگست سنہ ۱۹۴۰ء) مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں دفن ہوئے۔ (۳) مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی)۔ ناک کے بال اکھاڑنے سے سرطان ہوگیا تھا۔ پنج شنبہ ۲۳ شعبان سنہ ۱۳۵۹ھ (۲۶ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء)۔ جونپور میں دفن ہوئے۔ (۴) مرزا ابراہیم بیگ (ہفت روزہ سرگذشت علی گڑھ کے ایڈیٹر)۔ شنبہ ۱۰ ذی قعدہ سنہ ۱۳۹۰ھ (۲۹ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء)۔

حضرت استاذ الہند قاری ضیاء الدین احمد صاحب الٰہ آبادی علیہ الرحمہ نے میری طالب علمی کے زمانے میں فرمایا تھا کہ انشاء اللہ تم کو شاطبی شریف پڑھاؤں گا۔ صرف اس وعدے کا پاس کرتے ہوئے ایک ہزار میل کا سفر۔ قریب ستر سال کی عمر میں تن تنہا اختیار کیا۔

اور کئی جگہ گاڑی بدلتے ہوئے اتوار ۲۴ راگست سنہ ۱۹۴۱ء کو امراؤتی تشریف لائے اور پندرہ دن تک ہر فرصت میں شاطبی شریف کی تکمیل کرائی۔ ۶ ستمبر کو واپس تشریف لے گئے میں اُن کو ناگ پور تک پہنچانے گیا۔

شنبہ ۸ مئی سنہ ۱۹۴۳ء کو قبلہ والدہ صاحبہ کے ساتھ جبل پور سے ۸ بجے رات کو جاورہ کے لیے روانہ ہوا۔ رات کو ۳ بجے کھنڈوا سے دوسری گاڑی میں ۵ بجے سہ پہر جاورہ پہنچا۔ قبلہ ماموں عبدالعزیز خان صاحب کے یہاں پٹھان ٹولی میں قیام کیا۔ وہاں سے چھوٹے ماموں عبدالقدوس خان صاحب کے ساتھ ۱۷ مئی کو اجمیر شریف حاضر ہوا۔ وہاں میری گناہ گار آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ بیان سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ درگاہ شریف کی حاضری کے بعد تاراگڑھ بھی گیا۔ اجمیر شریف سے رات کو ۱/۲-۱۰ بجے کی گاڑی سے واپسی ہوئی۔ جاورہ ایک بجے دن کو پہنچا۔ ۲۱ رمئی کو جاورہ سے ۱۲ بجے دن کو واپسی ہوئی کھنڈوا ہوتے ہوئے دوسرے دن جبل پور پہنچا۔ جاورہ میں انتظام الدین صاحب بیرسٹر تھے اور ضامن علی صاحب PUBLIC PROSECUTOR تھے۔ اُن کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔

۔ ۱۱ رجون سنہ ۱۹۴۵ء کو اپنے بچپن کے دوست محمد یوسف کے ساتھ جبل پور سے الٰہ آباد کو روانہ ہوا۔ وہاں سے پارسل ایکسپرس میں بیٹھ کر دوسرے دن علی گڑھ پہنچا۔ ۱۶ جون کو میرٹھ ہوتا ہوا مظفر نگر دوسرے دن پہنچا۔ استاذی مولانا احسن مارہروی کی یاد میں وہاں مشاعرہ تھا۔ اُن کے استاد بھائی اختر نگینوی تشریف لائے تھے۔ نواب محشر (لوہارو) احسان دانش، ابر گنوری، صدیق، نازک، رعنا، رسول پوری وغیرہ نے شرکت کی۔ بھائی صغیر احسنی (م ۵ جون ۱۹۹۵ء) نے اچھا انتظام کیا۔ ۱۸ جون کو ہم لوگ دیوبند گئے۔ وہاں کا کتب خانہ دیکھا۔ پھر سہارن پور گئے۔ دوسرے دن رڑکی اور وہاں سے کلیر شریف میں حاضری دی۔ سہ پہر کو وہاں سے پھر رڑکی گئے۔ پھر ۳۲ میل بس میں بیٹھ کر مظفر نگر واپس پہنچے اور میرٹھ ہوتے ہوئے ۲۰ رجون کو علی گڑھ پہنچے۔ ۲۲ رجون کو وہاں سے آگرہ گئے۔ تاج محل، قلعہ، اعتماد الدولہ وغیرہ کے مزارات دیکھتے ہوئے آگرہ کینٹ اسٹیشن سے اٹارسی کے لیے روانہ ہوئے ۔ اور ۲۶ جون

کو جبل پور واپس ہوئے۔

۲۳ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۵ء کو اپنے بچپن کے دوست ڈاکٹر سید محمد سعید کے ساتھ امراؤتی سے ۱۰ بجے دن کو بس سے ۴۸ میل کے فاصلے پر باسیم پہنچے۔ وہاں عارف الرحمٰن صاحب (سب جج) کے یہاں رات کو قیام کیا۔ صبح ۱۰½ بجے وہاں سے بس میں روانہ ہو کر ۱۲ میل پر کنیرگانو پہنچے۔ وہاں سے نظام دکن کی حدود شروع ہوتی تھیں۔ وہاں سے ۱۸ میل پر ہنگولی اور وہاں سے ۵۱ میل پر ناندیڑ پہنچے۔ رات کو سوا بارہ بجے وہاں سے ریل میں سکندر آباد روانہ ہوئے۔ ۲۵ر اکتوبر کو ۸½ بجے صبح وہاں پہنچے۔ دوسرے دن وہاں سے حیدر آباد (دکن) گئے۔ نام پلی اسٹیشن پر ایک مسافر خانے میں قیام کیا۔ پھر میڈیکل کالج کے اُستاد ڈاکٹر مختار حسین صاحب کے یہاں ایک دن قیام کیا۔ ۳۰ر اکتوبر کو (کتب خانوں کی سیر کرنے کے بعد) امراؤتی کو روانہ ہوئے۔

۲۲ر مئی سنہ ۱۹۴۶ء کو منجھلے بھائی عبد الرحمٰن خان صاحب کے ساتھ جبل پور سے روانہ ہوا۔ کھنڈوا، اندور، اُجین، جاورہ، اجمیر شریف، جے پور، دہلی، آگرہ، فتح پور سیکری وغیرہ کی سیر کر کے ۲ر جون کو جبل پور واپسی ہوئی۔

شنبہ ۳۔ اگست سنہ ۱۹۶۸ء کو پونے ۵ بجے سہ پہر جناب نذیر صاحب کے ساتھ حیدر آباد سندھ کر عوامی گاڑی سے روانہ ہوا۔ دوسرے دن راولپنڈی ۳ بجے پہنچا۔ ریل کا کرایہ ۲۹ روپے ۸۰ پیسے تھا۔ سونے کے لیے مزید ۵ روپے فی سیٹ دینے پڑے۔ ۸ر اگست کو اسلام آباد میں تین دن قیام کے بعد ہم لوگ پشاور گئے۔ وہاں حضرت خواجہ محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ (جو حضرت مجددِ الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ تھے) جن کا مزار پشاور کینٹ اسٹیشن کے قریب کچہری روڈ کے پُل کے نیچے ہے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر اُن کے پیر بھائی مہابت خان کے مزار پر پہنچے جو پرانے قبرستان میں اپنے بھائی کے ساتھ ہیں۔ شہر میں مہابت خان کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد میں نماز ظہر ادا کی۔ پشاور سے شنبہ ۱۰ر اگست کو بس میں روانہ ہو کر دُرگئی، بٹ خیل، چک درا ہوتے ہوئے تھانہ حضرت خیل پہنچے۔

وہاں مولانا عبد اللہ فاروقی صاحب کے یہاں پہنچے۔ وہاں دو روز قیام کیا۔ پھر مولانا کے ساتھ ہم لوگ اوچ شریف (ریاست دیر) کے لیے روانہ ہوئے۔ چک درا (دو میل پر تھا) سے گُل باد ۳½ میل۔ پھر درسک ایک میل۔ پھر اوچ شریف ایک میل پر ہے۔ اوچ شریف میں قبلہ حکیم آغا جان صاحب اور اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر جمیل احمد صاحب نے بڑا اکرم فرمایا۔ اُن کے جدِّ امجد حضرت مُلّا محمد نسیم صدیقی علیہ الرحمہ (جو حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے) وہاں دفن ہیں۔ اُن کے تبرکات وہاں کی جامع مسجد کے ایک گوشہ (لور محل) میں محفوظ ہیں۔ حضرت مظہر شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے کپڑے (فرغل، تہمد اور وہ دھجیاں جن سے آپ کا خون پونچھا گیا تھا) وہاں محفوظ ہیں۔ اوچ شریف سے سات میل پر تالاش مقام ہے جہاں حضرت جلال الدین بُخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ وہاں بھی حاضر ہوئے۔ پھر واپس اوچ شریف سے حضرت خیل ہوتے ہوئے راولپنڈی اور وہاں سے سیالکوٹ حاضر ہوئے اور حضرت مُلّا عبد الحکیم رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یاب ہوئے۔ وہاں سے ہفتہ ۱۷ر اگست کو سرگودھا گئے۔ وہاں ٹیکسٹائل مل کے منیجر ظہور احمد صاحب کے یہاں قیام کیا۔ ۱۹ر اگست کو لائل پور گئے۔ وہاں بشیر محمد بلوچ صاحب چیف انجینئر کے بنگلے پر قیام کیا۔ بھائی عبد الحمید جالندھری کے والد صاحب (عبد الحبیب صاحب) سے بھی ملاقات کی۔ پھر سہ پہر کو ہوائی جہاز سے حیدر آباد واپس آئے۔

حیدر آباد سے احمد علی میمن۔ ڈاکٹر حبیب اللہ۔ بچل شاہ اور حاجی علیم الدین صاحب کے ساتھ راولپنڈی اور اسلام آباد ہوتا ہوا پشاور پہنچا۔ وہاں جمعہ ۲۲ر اگست سنہ ۱۹۶۹ء کو قریب ۴ بجے افغان ایرلائن کا ڈکوٹا ہوائی جہاز ملا۔ کرایہ ۷۳/- تھا اور واپسی کا ۱۳۹/-۔ لیکن اگر ایک ہفتے میں واپسی ہو جائے تو ۹۷/- میں واپسی کا ٹکٹ مل جاتا تھا۔ قریب ۴۰ منٹ میں سفر طے ہوا۔ کابل میں جمیل ہوٹل میں قیام کیا۔ اُس وقت پاکستانی ایک روپیہ وہاں کے دس افغانی

کے برابر تھا۔ جشنِ کابل ۲۳ر اگست سے ۱۰ دن تک منعقد ہوا کرتا تھا۔ کابل میں پُرانا قبرستان ہے وہاں حضرت تمیم عدوی رضی اللہ عنہ اور حضرت جُبیر انصاری رضی اللہ عنہ (دو صحابیوں) کے مزارات ساتھ ساتھ ہیں جو موجودہ بادشاہ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ مرحوم نے سبز سنگ مرمر سے تعمیر کرائے تھے۔ ۴۴ھ میں یہ دونوں صحابی وہاں تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے تھے اور شہید ہوئے۔ شہر میں جمیل ہوٹل سے قریب دو فرلانگ کے فاصلے پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت لیث ابن قیس رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ وہ ۸۱ھ میں شہید ہوئے تھے۔ ان کو دین کا "فاتح ثانی" اور "شاہ دو شمشیر" بھی کہتے ہیں کہ اُن کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں جب وہ کفار سے جنگ کر رہے تھے اور شہید ہوئے۔ کچھ فاصلے پر حضرت عاشقین رح اور حضرت عارفین رح کے مزارات ہیں۔ وہاں بھی حاضری دی۔ محلّہ سیاہ سنگ میں حضرت عزت اللہ مجدّدی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ وہ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں۔ اُن کا سجع ہے:۔ یا مجدد، عزت اللہ از تو عزت یافتہ

ایک دن بابر بادشاہ کے مزار کی طرف خود بخود بہت کشش ہوئی۔ وہ قریب دو میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کا انتقال آگرہ میں ہوا تھا لیکن اُن کی وصیت کے مطابق کابل میں دفن کیا گیا۔ (کابل شہر کے اندر ہی سے دریائے کابل شروع ہوتا ہے)

کابل میں بہت معروف بازار "شور بازار" کہلاتا ہے۔ وہیں نور المشائخ مُلّا "شور بازار" کا مکان ہے۔ اُن کے صاحبزادے حضرت ضیاء المشائخ مجدّدی مدظلہ قلعۂ جواد میں رہتے تھے۔ انھوں نے ہم لوگوں کی پُرتکلف دعوت کی۔ بہت شفقت سے پیش آئے۔ اُن کا بہت بڑا کتب خانہ ہے۔ (بعد میں اُن کے بھائی صدر المشائخ علیہ الرحمہ بھی وہاں دفن ہوئے۔ اُن کے مزار پر راقم الحروف کے اشعار لکھے ہوئے ہیں)۔

اتفاق سے اسی زمانے میں میر پور خاص (سندھ) سے مولانا محمد اسحٰق جان صاحب وہاں تشریف لے گئے تھے۔ اُن کے ساتھ پغمان (۱۳ میل پر) مولانا عبد السلام جان صاحب سرہندی کے یہاں بھی حاضری ہوئی۔ پغمان بہت خوب صورت مقام ہے۔ دو جھیلیں ہیں۔ قرغہ بھی بہت خوب صورت مقام ہے۔ پغمان کے راستے میں حضرت خواجہ محمد یار صاحب علیہ الرحمہ کے خلیفہ محمد مسافر علیہ الرحمہ کا مزار ہے۔ جمعہ ۲۹ر اگست۔ ۳ بجے دن کو ہوائی جہاز سے واپسی ہوئی۔

حج و زیارت کی سعادت محض اللہ تعالیٰ کے بے حد فضل سے ۱۹۵۳ء سے بار بار حاصل ہوئی۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۷۱ء کو عراقی ایر لائن سے بغداد شریف ہوتا ہوئے جدّہ پہنچا۔ بغداد شریف میں بیس گھنٹے کا قیام تھا۔ ہم لوگ گیارہ افراد تھے۔ سولہ گھنٹے ایک ٹیکسی میں سفر کیا۔ وہاں سب سے پہلے حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے۔ پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حاضری دی۔ پھر حضرت امام موسیٰ الکاظم رضی اللہ عنہ اور اُنھی کے ساتھ امام تقی رضی اللہ عنہ اور اُنھی کے احاطے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے صوفیہ بھی ہیں۔ اُس احاطے میں حنفی مدرسہ بھی ہے۔ وہاں سے قریب ۲۵ میل کے فاصلے پر مدائن شہر ہے جہاں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن کے قریب ہی حضرت حذیفہ الیمانی رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ کو ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ کو دجلہ کے قریب سے لاکر آسودۂ خاک کیا گیا ہے کہ ان دونوں صحابیوں نے اپنی قبروں میں پانی آجانے کی وجہ سے عراق کے بادشاہ فیصل کو خواب میں ایسا بتایا تھا۔

وہاں سے ہم لوگ ۴ بجے صبح کو قریب سوا سو میل کے فاصلے پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر ہوئے اور وہیں احاطے میں فجر کی نماز پڑھی۔ پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری دی۔ نجف اشرف بھی گئے جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار کہا جاتا ہے۔ وہاں سے واپسی پر بغداد شریف کے ہوائی اڈے پر ۱۲ بجے دن کو پہنچے۔ وہاں سے جدّہ اور جدّہ سے سیدھے مدینہ منوّرہ حاضر ہوئے۔ ۷ر ذی الحجہ کو ہم لوگ مدینہ منوّرہ سے مکّہ معظمہ حاضر ہوئے۔ حج جمعہ ۵ فروری کو تھا۔ ۱۲ر فروری ۱۹۷۱ء کو جدّہ سے بغداد شریف ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ اس مرتبہ مدینہ منوّرہ میں مسجد قُبا کے پیچھے مسجد شمس، مسجد غرس، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

والا باغ، خاکِ شفا کا میدان، جبلِ اُحد کا غار اور وہ چٹان جہاں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سرِ مبارک کے ٹیک لگانے سے گڑھا پڑ گیا تھا۔ جبلِ اُحد کے دوسرے شہداء۔ باب الصدیق کے سامنے گلی میں حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ، پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد حضرت عبد اللہ اور گلی کے آخر میں حضرت مالک بن سنان رضی اللہ عنہ کے یہاں حاضری دی۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو پھر شرف حاصل ہوا۔ ۲۸ر دسمبر کو جدہ سے مدینہ منورہ کو روانگی ہوئی۔ میرے گھٹنوں کی تکلیف جو قریباً ڈھائی ماہ سے تھی راستے میں ظہر کی نماز کے وقت یک لخت ختم ہو گئی۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لیے اور ساتھیوں کے لیے عرض کیا تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لکھا ہوا تھا "طُوبیٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآب" ۱۳ر جنوری کو حج ہوا۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۷۲ء کو کراچی واپسی ہوئی۔

سہ شنبہ ۸ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو ۱۱ بجے رات روانگی ہوئی۔ تین گھنٹے میں مدینہ منورہ پہنچے۔ اصطفا منزل میں قیام کیا۔ جمعہ ۲۰ر دسمبر کو ہوائی جہاز سے جدہ پہنچے۔ دوسرے دن مکہ معظمہ حاضری ہوئی۔ ۸ر ذی الحجہ کی صبح کو منیٰ روانہ ہوئے۔ حج دوسرے دن یعنی ۲۳ر دسمبر کو ہوا۔ ۲۶ر دسمبر کو مکہ معظمہ واپسی ہوئی۔ ۲۹ر دسمبر کو جدہ اور ۳۱ر دسمبر کو وہاں سے کراچی (سوا تین گھنٹے میں) پہنچ گئے۔ (یہ میرا آخری حج ہوا۔

۸ر اگست ۱۹۷۱ء کو ہم لوگ گلگت اور ہُنزہ کے لیے روانہ ہوئے۔ لاہور میں ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب مرحوم کے بنگلے پر قیام کیا۔ وہاں سے راولپنڈی ہوتے ہوئے اسلام آباد پہنچے۔ ڈاکٹر بالی پوتہ صاحب۔ اُن کے بیٹے شہاب میاں، شعور احمد فاروقی صاحب، احمد خان صاحب، محمد شریف صاحب، ڈاکٹر معصومی صاحب اور مولانا محمد اسحٰق جان سرہندی صاحب (میرپور خاص والے) کے ساتھ یہ عاجز بھی اسلام آباد سے ہوائی جہاز میں گلگت پہنچا۔ وہاں شعور احمد صاحب کے صاحبزادے کیپٹن شہور احمد مل گئے۔ وہ اپنے ساتھ فوجی کیمپ لے گئے۔ وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ ظہر کی نماز کے بعد جیپ میں ہُنزہ روانہ ہوئے۔ راستہ صاف نہیں تھا۔ عشاء کے وقت گنیش مقام پر پہنچے۔ رات وہاں آرام کیا اور صبح کو ناشتہ کر کے کریم آباد پہنچے۔ وہاں امیرِ ہُنزا کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ وہاں سواری کی دِقت تھی اس لیے مجبوراً ایک ہفتہ رہنا پڑا اور ۱۹ر اگست کو وہاں سے واپسی ہوئی۔ وہاں کا پانی بہت ثقیل ہے۔ چشمے اور ندیاں ضرور ہیں لیکن پانی اچھا نہیں۔ مردوں کے لیے مُضر ہے۔ عورتیں سب کام (گھر باہر کا) کرتی ہیں۔ کاشت صرف چھوٹے چھوٹے سیب اور آڑو کی ہوتی ہے۔ اُن کو سُکھا کر روٹی بنا لیتی ہیں۔ خوجے لوگ ہیں۔ مرد عموماً ۳۵ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہتے۔ وہاں کے امیر کے چچا زاد بھائی سردار بہادر خان نے ہم لوگوں کو چائے پر مدعو کیا۔ گلِ مِت میں اُن کا قیام تھا۔ وہاں سے قریب ۹۰ میل پر چین کی سرحد خنجر آب شروع ہوتی ہے۔ سیاہ چنگ۔ (سیاچن) کا گلیشیر بھی وہاں سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نہیں گیا۔ بعض حضرات وہاں بھی گئے۔ وہاں سے واپسی پر گلگت میں ایک رات قیام کیا۔ وہاں بھوک لگی۔ TROUT مچھلی کھائی۔ ہوائی جہاز سے ۲۲ر اگست کو واپس ہوئے۔ پھر کیمبل پور ہوتے ہوئے غُرغُشتی پہنچے۔ جہاں میری ننھیال کے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ وہاں سے کیمبل پور کے راستے سے پشاور پہنچے۔ وہاں ریلوے اسٹیشن کے قریب حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ وہاں حاضر ہوئے۔ پھر سیالکوٹ میں حضرت مولانا عبد الحکیم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں سے لاہور ہوتے ہوئے ۲۹ر اگست کو حیدر آباد پہنچے۔

شنبہ ۵ر اگست ۱۹۷۲ء کو میرے ساتھ ضمیر صاحب، شریف صاحب اور مزمل صاحب حیدر آباد سے تیز رو گاڑی سے ۲½ بجے دن کو لاہور روانہ ہوئے۔ دوسرے دن صبح ۸½ بجے لاہور پہنچے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے بنگلے پر قیام کیا۔ لاہور میں افتخار صاحب، بھائی عبد الحمید صاحب اور سعادت علی قریشی صاحب کے یہاں دعوت

کھائی۔ منگل کو وہاں سے راولپنڈی، پھر اسلام آباد میں قیام کیا۔ جمعرات کو وہاں سے سیالکوٹ گئے۔ حضرت عبدالحکیم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی۔ پھر لاہور۔ پاک پٹن شریف اور ملتان کے بزرگوں کے یہاں حاضری دی اور ۱۳ راگست کو حیدرآباد واپس آئے۔

(گولڑا شریف۔ موڑا شریف۔ بالاکوٹ۔ مظفر آباد۔ سوات۔ ایبٹ آباد وغیرہ مقامات پر بھی حاضر ہوا ہوں)

؎ شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد (نظیری)

ڈاکٹر ابواللیث صاحب

مُحب مکرم ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے) میرے دیرینہ مخلصین میں تھے۔ وہ بدایوں سے انٹر پاس کر کے ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آئے اور بی اے آنرز (اردو) میں داخلہ لیا۔ چند روز حضرت قاری ضیاالدین احمد (۱۳۷۱ھ۔۱۹۵۲ء) کی کلاس (تجوید و قرارت) میں شرکت کی، اس لیے مجھے اُن سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے ۱۹۳۵ء میں فارسی میں ایم اے کیا، پھر بعض احباب کے مشورے سے ایم اے (اردو) پاس کرنے کا خیال ہوا تو مولانا احسن مارہرویؒ (م ۱۹۴۰ء) کی کلاس میں اُن کی اجازت سے بیٹھنے لگا۔ کبھی کبھی پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب (م ۱۹۷۷ء) کی کلاس میں بھی چلا جاتا۔ ابواللیث صاحب سے ملاقات ہو جاتی تھی اُنھوں نے اُسی وقت سے تحقیقی کاموں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ میں نے ۱۹۳۶ء میں ایم اے (اردو) پاس کرنے کے بعد وطن کی طرف رُخ کیا۔ وہ علی گڑھ ہی میں رہے اور ۱۹۳۷ء میں آنرز پاس کر کے ۱۹۳۸ء میں انھوں نے ایم اے پاس کیا اور وہیں کچھ عرصے کے بعد لیکچرر ہو گئے۔ پھر انھوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں اپنا مقالہ "لکھنو کا دبستانِ شاعری" پی ایچ ڈی کے لیے تیار کیا۔ علی گڑھ میں اردو کے سب سے پہلے پی ایچ ڈی وہی تھے۔ اور یونی ورسٹی میگزین کے ایڈیٹر بھی تھے۔

میں علی گڑھ سے آنے کے بعد وطن میں چند ماہ تک بے کار رہا پھر پبلک سروس کمیشن نے مجھے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو کا اُستاد مقرر کیا۔ وہاں دس سال رہنے کے بعد مجھے مارس کالج ناگ پور بھیج دیا گیا! اس عرصے میں کبھی کبھی ابواللیث صاحب سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے لیکن وہاں زیادہ

قیام نہیں رہا۔ پھر وہ وہاں سے آکر اورینٹل کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں مجھے کراچی آنا پڑا۔ اسلامیہ کالج میں دو سال اور اردو کالج میں چھ سال رہا۔ ۱۹۵۵ء میں کراچی یونی ورسٹی نے ایم اے کی کلاسیں شروع کیں تو بعض حضرات کے ساتھ اردو کالج کی جماعتوں کے ساتھ یونی ورسٹی کے ایم اے (اردو) کی جماعتیں بھی پڑھانے لگا۔

۱۹۵۶ء میں کراچی یونی ورسٹی نے ابواللیث صاحب کو صدرِ شعبۂ اردو کی حیثیت سے بلوا لیا① اور مجھے سندھ یونی ورسٹی نے پروفیسر اور صدرِ شعبہ مقرر کیا۔ اس کے بعد ایم اے (اردو) فائنل کے زبانی امتحان کے لیے ہر سال (اور پی ایچ ڈی کے لیے اکثر) اُن کو زحمت دیا کرتا تھا۔ فارسی کے لیے ڈاکٹر غلام سرور صاحب بھی کرم فرمایا کرتے تھے اور یہ دونوں حضرات اس عاجز کو کراچی یونی ورسٹی میں طلب فرماتے تھے۔

ڈاکٹر ابواللیث صاحب جب یونی ورسٹی تشریف لاتے تھے تو اُن کی بیگم صاحبہ مرحومہ بھی اکثر ساتھ ہی تشریف لاتی تھیں اور میری اہلیہ مرحومہ پر کرم فرماتی تھیں۔ ان کا مختصر قیام غریب خانے ہی میں ہوا کرتا تھا۔ بیگم صاحبہ مرحومہ سے ہم لوگوں کے بہت ہی مخلصانہ تعلقات تھے۔ میں جب کراچی جاتا تو اُن سے ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے بڑے لڑکے کا نکاح پڑھانے کی بھی دعوت دی تھی اور ہمیشہ اپنے ذاتی معاملات پر بھی گفتگو فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی امتحان کے سلسلے میں کراچی حاضر ہوا تو اُن کی بیگم صاحبہ نے بہت دیر تک اپنے معاملات اور معمولات بیان کیے اور پھر فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص سورۃ اذا جاء نصر اللہ ..... پڑھ رہا ہے۔ میں چونکا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ پھر ہوا وہی جو خواب میں اشارہ تھا۔ یعنی صرف چار دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر صاحب کو

---

① ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کراچی یونی ورسٹی میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۱ء تک ریڈر رہے۔ دوسرے سال سے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں کولمبیا یونی ورسٹی میں پوسٹ ڈاکٹرل پروگرام کیے تھے۔

سخت قلق ہوا جیسا کہ ہر بوڑھے آدمی کو اُس کے ساتھی کے چھوٹ جانے کا قلق ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں ہمت دی اور وہ ہر روز بلا ناغہ اپنی بیگم صاحبہ کی قبر پر قرآن خوانی کے لیے جانے لگے۔ ① اُن کا یہ معمول آخری دنوں تک قائم لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ بھی یکایک ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔

سنگ آمد وسخت آمد:-

آج وہ کل ہماری باری ہے

چہارشنبہ، ۷ستمبر ۱۹۹۴ء (۲۹ ربیع الاوّل ۱۴۱۵ھ) کا دن شاید مشکل سے فراموش ہو سکے گا۔

ڈاکٹر صاحب سچے اور پکے مسلمان تھے۔ نماز، روزہ (حج اور عمرہ بھی) انھیں مرغوب ومحبوب تھا۔ بار ہا انھوں نے فرمایا کہ میں ان شعائر کا اس لیے بھی پابند ہوں کہ طلبہ بھی دین کی طرف رجوع ہوں اور فیشن کے طور پر دین سے بے تعلقی ظاہر نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں رحمتیں نازل فرماتا رہے۔ آمین۔ ثم آمین۔

حواشی

① محترم ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب نے ہماری زبان (دہلی ۸ دسمبر ۱۹۹۴ء) میں ڈاکٹر ابواللیث صاحب سے متعلق تحقیقی اور تفصیلی مضمون شایع فرمایا۔

تلاوتِ قرآن کی برکت سے ڈاکٹر ابواللیث صاحب کی آنکھوں میں ایسی روشنی آگئی تھی کہ عینک جو شروع سے لگاتے تھے وہ یک لخت چھوٹ گئی تھی۔

شور صاحب

شور صاحب (اللہ بخشے) میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ اُن کا بچپن کا نام منظور علی تھا۔ جیسا کہ مَیں نے اُن کے مکان پر ایک کتاب میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔ بعد میں اُن کا نام منظور حسین ہوا۔ ددھیال ایلچپور کی تھی اور ننھیال آکولہ کی تھی۔ یہ دونوں شہر برار میں ہیں وہ امراؤتی (برار) کی شہر پناہ کے ناگ پوری دروازے کے قریب ایک آبادی میں جو سادات کی تھی دسمبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد ضامن علی صاحب جو بعد میں کراچی آ کر ۱۹۶۸ء میں فوت ہوئے۔ تھانیدار تھے۔ بہت سیدھے سادے تھے۔ امراؤتی میں بارہا ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا تھا۔ شور صاحب کی ابتدائی تعلیم امراؤتی ہی کے محمدن ہائی اسکول میں ہوئی۔ اس زمانے میں میٹرک کی گیارہویں جماعت ہوا کرتی تھی۔ یہ اسکول جس کا نام اب تبدیل کر دیا گیا ہے، مال ٹیکری کے قریب ہے اور اب اس ٹیکری پر شیواجی کا مجسمہ نصب کر دیا گیا ہے۔ شور صاحب نے ۱۹۲۸ء میں وہاں سے میٹرک پاس کیا پھر علی گڑھ تشریف لے گئے۔ وہاں میرس ہوسٹل میں اُن کا قیام تھا۔ ناگ پور کے مونس حسین ان کے خاص دوست تھے، علی گڑھ کے انٹرمیڈیٹ کالج میں اُس وقت نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں چار جماعتیں تھیں۔ میرس ہوسٹل اردن سرکل (یانیو سرکل) کے چار ہوسٹلوں میں سے ایک تھا۔ اس کے علاوہ منٹو سرکل میں ان طلبہ کے لیے چار ہوسٹل تھے اور وہاں دو ہوسٹلوں (اے۔ بی) میں تعلیم بھی ہوا کرتی تھی۔ ڈے اسکالر اور سیمی بورڈ ان کے علاوہ تھے۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم کی وجہ سے طلبہ میں شعر و شاعری کا ذوق زیادہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ طرحی مشاعرے بھی منعقد کراتے تھے اور کُل ہند مشاعرے بھی اُنھی کے دم سے قائم ہوئے تھے۔ شور صاحب کی شاعری کا شور اسی زمانے میں ہوا۔ اور مولانا مرحوم ان کی شاعری سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شور صاحب کی یہ غزل بہت مشہور ہوئی:-

دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے ہم فریبِ زندگی میں آ گئے

نظم بھی اسی زمانے میں انھوں نے شروع کی تھی اور اکثر شعر گوئی میں مصروف رہتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے انٹر پاس کیا۔ پھر بی اے اور ایم اے (فارسی) نیز ایل ایل بی کے زمانے میں وہ کچی بارک میں رہنے لگے تھے۔ اُسی کو پختہ ہونے کے بعد S. M. EAST ہوسٹل کہا جاتا تھا۔ اسی ہوسٹل میں ریاست ریواں کے اختر حسین نظامی (جو بعد میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے) اور سیہورا (ضلع جبل پور) کے غلام احمد انصاری بھی شور صاحب کے احباب میں سے تھے۔ ۱۹۳۶ء کے اواخر میں سی پی گورنمنٹ کے ہوم منسٹر رگھو وندر راؤ کے ساتھ ناگ پور کے نواب صدیق علی خاں مرحوم علی گڑھ تشریف لائے۔ وائس چانسلر صاحب نے اس موقع پر اُن کی دعوت کی اور سی پی و برار کے طلبہ کو بھی مدعو کیا۔ شور صاحب اور نامدار خاں صاحب ان طلبہ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹۳۴ء میں شور صاحب نے ایم اے فائنل (فارسی) کا امتحان دیا۔ اسٹریچی ہال میں امتحان تھا اور ساتھ ہی بی اے فارسی کا امتحان بھی وہیں تھا۔ ایم اے کے پرچے کا رنگ نیلا ہوتا تھا اور بی اے کے پرچے کا رنگ سبز ہوتا تھا۔ ایم اے کے پرچے میں اخلاق جلالی اور چہار مقالہ کے اقتباسات ترجمہ و تشریح کے لیے تھے اور انھی دونوں کتابوں کے کچھ اقتباسات بی اے کے پرچے میں بھی تھے۔ شور صاحب نے بی اے کا پرچہ لے لیا اور تین گھنٹے تک اسی کو حل کرتے رہے، وقت ختم ہونے پر غلام احمد مدنی صاحب کے ساتھ راقم الحروف بھی شور صاحب کے پرچے کے متعلق پوچھنے گیا، ان کے ہاتھ میں بی اے کا پرچہ تھا، ہم سب گھبرا گئے کہ اب کیا ہوگا۔ غلام احمد مدنی صاحب فوراً اپنے والد نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے پاس دوڑتے ہوئے گئے۔

نواب صاحب اس زمانے میں وہاں ٹریزرر (خازن) تھے وہ بنفسِ نفیس تشریف لائے اور شور صاحب کو ہال کے اندر لے جا کر ایم اے کا پرچہ دیا۔ کھانا کھلایا، تسلی دی۔ اس طرح انھوں نے ایم اے کا پہلا پرچہ حل کیا۔

۱۹۳۴ء میں شورؔ صاحب ایم اے (فارسی) پاس کر کے وطن پہنچے۔ اس وقت کسی کالج میں جگہ خالی نہیں تھی۔ اس لیے ناگ پور کے انجمن اسلامیہ اسکول میں مُدرّس ہو گئے اور قریب تین سال تک وہیں رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ناگ پور یونی ورسٹی سے ایک ایم اے اور پاس کیا۔ راقم الحروف ان سے ایک سال پیچھے تھا۔ ۱۹۳۵ء میں فارسی میں اور ۱۹۳۶ء میں اُردو میں (ایل ایل بی بھی) علی گڑھ سے ایم اے پاس کر کے اپنے وطن جبل پور واپس ہوا۔ چند ماہ بعد پبلک سروس کمیشن نے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں اردو کے اُستاد کے لیے اشتہار دیا۔ اس زمانے میں ۲۵ سال عمر کی سخت قید تھی۔ کمیشن نے انٹرویو کے لیے مجھے طلب کیا لیکن شورؔ صاحب کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو طلب نہیں کیا۔[1]

جولائی ۱۹۳۷ء میں میرا تقرر ہو گیا۔ پھر جب کانگریس کی ڈھائی سالہ حکومت قائم ہوئی تو شورؔ صاحب کے والد صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر پٹ وردھن[2] کی کوشش سے ۱۹۳۸ء میں ان کو MORRIS CLLEGE میں فارسی کا لیکچرار بنا دیا گیا۔

راقم الحروف کنگ ایڈورڈ کالج میں تھا۔ قریب ڈھائی سال کے بعد ناگ پور یونیورسٹی نے مجھے صدر شعبۂ اردو بنا دیا۔ پھر جب ۱۹۴۳ء میں سید رفیع الدین صاحب مارس کالج میں عربی کے لیکچرر ہوئے تو شورؔ صاحب کے ساتھ ہم لوگ "اتحادِ ثلاثہ" کی حیثیت سے یونی ورسٹی کے مرہٹہ اور ہندی کے دو گروپ کے لیے BALANCING POWER بن گئے اور اللہ کی شان کہ دونوں گروپ ہم لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں شورؔ صاحب کا تبادلہ مارس کالج ناگ پور سے کنگ ایڈورڈ کالج ہو گیا۔ وہاں کالج کے ایک بنگلے میں ان کا قیام تھا۔ اپنے والد صاحب سے ملنے کے لیے وہ شہر گئے ہوئے تھے۔ بچے بھی ساتھ تھے چوروں نے موقع پا کر تمام قیمتی سامان غائب کر دیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ کھانا پکایا اور چائے بنا کر پیتے رہے۔ بڑا افسوس ہوا۔

کالج میں ہر سال بڑے پیمانے پر ادبی موضوع پر مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ کالج کے اساتذہ اور شہر کے وکلاء بھی حصہ لیتے تھے۔ سالانہ مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ باہر سے کسی بڑے شاعر کو دعوت دی جاتی تھی۔ کالج کے طلبہ بھی معمول کے مطابق کچھ اپنی غزلیں کچھ غیر معروف شعراء کی غزلوں میں اپنا تخلص ڈال کر سُنایا کرتے تھے۔ لوگ حسبِ معمول بغیر سمجھے ہوئے واہ واہ کہا کرتے تھے۔ لیکن اچھا خاصا اجتماع ہو جاتا تھا۔ پھر شورؔ صاحب کے آجانے سے اس اجتماع میں اضافہ ہونے لگا۔ وہاں دسمبر کے آخری ہفتے میں قدیم اور موجودہ طلبہ بھی جمع ہوتے تھے وہ REUNION DAY کہلاتے تھے۔

مختلف کھیلوں اور تقریبوں میں وہ سب شرکت کرتے تھے اور مختلف زبانوں میں تقریریں بھی ہوا کرتی تھیں۔ یعنی ہندی، اردو، مرہٹی اور سنسکرت میں طلبہ تقریر کرتے تھے۔ شورؔ صاحب سے کہا گیا کہ فارسی میں طلبہ سے تقریر کرائیں۔ وہ فکرمند ہوئے۔ میں نے کہا کہ آپ کچھ فکر نہ کریں میں انتظام کیے دیتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تقریروں کے لیے جج صاحبان ایسے ہوں گے جو عربی اور فارسی سے بالکل نابلد ہوں گے۔ میں نے طلبہ کو بُلایا اور اُن سے پوچھا کہ تم کو قرآن پاک کی کتنی سورتیں یاد ہیں؟ چار پانچ طلبہ ایسے تھے جن کو دس دس بارہ بارہ سورتیں یاد تھیں۔ میں نے کہا کہ ہال میں کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر سورتیں پڑھ دینا۔ جج صاحبان آئے۔ طلبہ نے اسی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر سب کو خطاب کرتے ہوئے سورتیں پڑھنی شروع کیں۔ تمام سامعین ہنستے رہے اور قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔ جج صاحبان مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے میں نے کہا بعد میں بتاؤں گا۔ بہرحال ان طلبہ کو انعامات ملے اور جج صاحبان نے اُن

---

[1] گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) سے شورؔ صاحب ۱۹۶۹ء میں (یعنی ۶۰ سال کی عمر میں) ریٹائر ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرٹیفکٹ میں ان کی عمر کیا رہی ہوگی۔

[2] شورؔ صاحب نے کسی موقع پر اسائے وکیل کو اپنا ہمدرد کہا ہے۔ طلوعِ افکار کے خاطبے میں نسیان کی وجہ سے کئی باتیں انھوں نے صحیح نہیں کہیں۔ اس وکیل نے ۱۹۳۹ء میں مسلمانوں کے خلاف ہر مہنڈا کی فوج تیار کی۔ اس کا سردار خود بنا۔ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کی بیوی نے اُس کی پوجا کی اور اسے رخصت کیا۔ دوسری ایک مسلمان بڑے میاں نے رسی کی منجنیق سے ایک پتھر اس کی ناک پر رسید کیا تو وہ گھوڑے سے گر پڑا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔

کی "فاضلانہ" تقریروں پر داد بھی دی۔

۱۹۴۷ء میں مجھے کنگ ایڈورڈ کالج سے مارس کالج ناگ پور بھیج دیا گیا۔ تقسیم ہند سے جو قیامت برپا ہوئی وہ چنگیز اور ہلاکو کی سفاکی سے بھی زیادہ ہوگی۔ بے شمار جانیں بھینٹ چڑھ گئیں۔ پشتہا پشت کی میراث یک لخت چھوڑنی پڑی۔ سی پی اور برار میں تباہی کم ہوئی تھی۔ لیکن دوسری جگہوں کے خونچکاں واقعات سُن کر وہاں کے مسلمان بھی خائف ہوئے اور لاکھوں کی تعداد میں اس صوبے کو چھوڑنے پر آمادہ ہوئے[1]۔ بہت سے لوگ حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں ان کو معاش کے ذرائع بہم پہنچائے گئے اور وہاں کے امراء نے مہاجروں کے قیام و طعام کا بہت معقول انتظام کیا۔ جو لوگ پاکستان آنا چاہتے تھے وہ بمبئی پہنچنے لگے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بھی دل کھول کر مہمان نوازی کی اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ راقم الحروف کے دو بچے بڑے بھائی کے ساتھ کراچی آچکے تھے۔ اس لیے مجھے بھی کالج سے رخصت لے کر (اہلیہ اور شیر خوار بچے کے ساتھ) کراچی کا رُخ کرنا پڑا۔ ۷ نومبر کو وہاں پہنچا، ۲۴ نومبر کو بچہ فوت ہوگیا اور ۲۸ نومبر کو اُس کی والدہ بھی چل بسیں۔ ناگ پور سے پروفیسر رفیع الدین صاحب نے مجھے لکھا کہ واپس ناگ پور آجاؤ اور مارچ تک کام کر کے اپریل سے تین ماہ کی تعطیل میں کراچی چلے جانا۔ ان کے اصرار پر دسمبر میں ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچا اور وہاں سے ریل میں ناگ پور پہنچ گیا۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں جو چھٹیاں ہوئیں تو میں حیدرآباد (دکن) چلا گیا۔ وہاں میرے بہت سے اعزا تھے۔ ایک دن بازار سے گزرا تو وہاں شور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی

---

[1] ہر روز گرانڈ ٹرنک ایکسپریس جو دہلی، آگرہ، گوالیار، بھوپال اور اٹارسی ہوتی ہوئی سپہر کو ناگ پور پہنچتی تھی اس میں بکثرت لاشیں ہوتی تھیں اور ڈبے خون کے فواروں کی رنگے ہوئے ہوتے تھے۔ ناگ پور اسٹیشن پر یہ ڈبے دھوئے جاتے تھے اور لاشیں نکالی جاتی تھیں۔ اس منظر سے خوف طاری ہوگیا تھا۔

میں ان کو جگہ مل گئی تھی۔ لیکن بقول ان کے "وہاں میں نے ابھی پڑھایا بھی نہیں تھا، ایک سیشن پورا کہ FALL ہوگیا"[1] یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے۔ سقوطِ حیدرآباد کے بعد وہ امراؤتی واپس آئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد کراچی پہنچ گئے۔ وہاں کوئی مناسب جگہ نہیں تھی تو پرنسپل تاج محمد خیالؔ نے زمیندار کالج گجرات میں ان کو فارسی کا سینیر لیکچرر مقرر کرا دیا۔ قریب ڈیڑھ سال کے بعد اسلامیہ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی) مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم اے پاس کیا اور فیصل آباد کے کالج میں انگریزی بھی پڑھائی۔ ایک سال کے بعد ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور میں فارسی کے پروفیسر بنا دیے گئے لیکن ۱۹۶۱ء میں جب اس کالج میں ایم اے (اُردو) کا شعبہ قائم ہوا تو اُردو اور فارسی کے شعبے کے صدر بنا دیے گئے اور ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہو کر کراچی واپس آگئے۔ ۲ جولائی ۱۹۹۴ء کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا اور ۵ دن کے بعد ۷ جولائی کو ان کی وفات ہوئی۔ شورؔ صاحب جب گجرات اور فیصل آباد میں تھے تو حیدرآباد کے مشاعروں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے۔ یہاں حافظ مبارک علی مرحوم کے مکان میں اُن کا قیام رہتا تھا لیکن مجھ سے ملنے کے لیے یونی ورسٹی میں ضرور قدم رنجہ فرماتے تھے[2]۔

یہاں تک تو ان کے عام حالات درج کیے گئے۔ ان کے بچپن اور نوعمری کی چند باتیں بھی عرض کرنا بے محل نہ ہوگا۔ وہ بہت نازک مزاج اور نازک اندام تھے۔ ذرا میں خوش اور ذرا میں ناراض ہو جاتے تھے۔ اپنے بچپن کے دوست عبدالرحمٰن خالدی (جو بعد میں علی گڑھ میں کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہوئے) اور علاؤ الدین قاضی (جو بعد میں امراؤتی کے مشہور وکیل ہوئے) ان سے دور ہو گئے تھے۔ کالج میں بھی پروفیسر سنہا (جونیر) ان سے گھبراتا تھا۔ وہ نہایت خلوص اور محبت سے باتیں کرتے کرتے (شعر گوئی میں) استغراق کی وجہ سے

---

[1] طلوعِ افکار۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۹۴ء، ص ۱۷۔ [2] راقم الحروف کراچی آکر ۱۹۴۸ء

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک دم خاموش ہو جاتے تھے۔ عزیزی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ۱۹۸۴ء میں ان کے متعلق لکھا تھا کہ "پروفیسر منظور حسین شورؔ اپنی شخصیت اور زندگی کی ظاہری صورتوں میں نہ صرف اپنے گرد و پیش سے بلکہ کبھی کبھی اپنی ذات و صفات سے بھی لاتعلق سے معلوم ہوتے ہیں، وہ کسی عالم میں بھی ہوں عموماً اپنے ہی عالم میں رہتے ہیں۔ چناں چہ بھری محفل میں اکثر تنہا نظر آتے ہیں"......

شورؔ صاحب نے بچپن ہی میں شاعری (بلکہ عاشقی) شروع کی تھی۔ موسیقی بھی سیکھی تھی۔ خوب لکھتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض مشاعروں میں وہ کئی کئی گھنٹے اپنا کلام زبانی سُناتے تھے۔ ملک کے مختلف شہروں کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور نیاز فتح پوری کے رسالۂ نگار کے لیے اپنی غزلیں اور نظمیں برابر بھیجا کرتے تھے۔ ان کے کلام کے مجموعے یہ ہیں:-

نبضِ دوراں (۱۹۵۹ء) دیوارِ ابد (۱۹۶۹ء) یہ مجموعہ انھوں نے راقم الحروف کے نام (اقبالؔ کے ایک شعر کے ساتھ) معنون کیا تھا۔ سوادِ سیم تناں (۱۹۸۳ء) صلیبِ انقلاب (۱۹۸۵ء) میرے معبود (طویل نظم ۱۹۸۴ء) زیرِ طبع مجموعے :- حشر مرتّب (غزلیات) ذہن و ضمیر (رُباعیات)[1] انگشتِ نیل (تنقید) افکار و اعصار (نثری ادب) اندر کا آدمی (نفسیاتی مضامین)........

اللہ بخشے عجیب خوبیاں تھیں .... اُن کا ایک ہی

(بقیہ حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) میں اسلامیہ کالج میں اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک اردو کالج میں (اور یونی ورسٹی کی بھی ایم اے کلاس) پڑھاتا رہا۔ پھر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک سندھ یونی ورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد چار سال کی توسیع ملازمت بھی ہوئی۔

[1] محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے ہماری زبان (دلی ۱۵ر نومبر ۱۹۹۴ء) میں "کچھ چراغ اور بجھے" کے عنوان سے ایک مضمون شایع کیا ہے، جس میں شورؔ مرحوم کی تصانیف کا ذکر بھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ذہن و ضمیر" ان کی آخری کتاب ہے جو ۱۹۹۱ء میں شایع ہو گئی ہے۔

خط محفوظ رہ گیا ہے۔ وہ درج ذیل ہے:-

۹۱۷/۲۴ فیڈرل بی ایریا، کراچی
۳۰ر دسمبر ۱۹۸۴ء

برادر محترم ڈاکٹر صاحب زاد الطافکم

سلام علیکم! ماسٹر عثمان صاحب کی وساطت سے نگارشِ عالیہ "ہمارا علم و ادب" کی ایک جلد موصول ہوئی، ایک شخص نے میرے مطبوعہ تین شعری مجموعات سے جمالیاتی مزاج کی منظومات کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی شکل دیدی! اس کتاب میں آتش کی جوانی سے لیکر کل تک جمالیاتی مزاج کی نظمیں بڑی تعداد میں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں، ہرچند یہ نگارش اس قابل نہیں کہ آپ کو پیش کی جائے، تاہم ع ہر کہ خواند دعا طمع دارم کہتے ہوئے "سوادِ سیم تناں" کی ایک جلد ارسالِ خدمت کر رہا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو صحت اور درازیٔ عمر عطا فرمائے، آمین۔ آپ کا بھائی

منظور حسین شورؔ

آہ میرے ہاشمی !

سید یحییٰ احمد ہاشمی میرے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن مکہ معظمہ کی جنت المعلیٰ میں بے شمار رحمتوں اور نعمتوں کی آغوش میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اُن کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے کیوں نہ کہوں کہ ان کی زندگی اور موت دونوں میرے لیے قابلِ رشک ہیں کاش آخرت میں مجھے اُن کی معیت حاصل ہو!

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۝ (آمین)

وہ کئی سال سے حیدرآباد چھوڑ کر اسٹیل مل کراچی کی کالونی میں اپنے بڑے بیٹے زبیر میاں کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ یہاں آتے رہتے تھے۔ ابھی وہ اپنی بڑی بیٹی کے یہاں آئے ہوئے تھے کہ ۲۱ جنوری اور ۲۲ جنوری کو دیر تک میرے ساتھ خوش کلامی کرتے رہے۔ ۲۳ جنوری کو عصر کے وقت مراقبے میں بھی شریک رہے اور مجھ سے خوش خوش رخصت ہو کر گئے۔ ۲۷ جنوری کی صبح کو ہوائی جہاز سے جدہ روانہ ہوئے۔

وہاں ایک دن عبدالغفار صاحب لکھنوی کے یہاں جو (A. G KHAN کے نام سے زیادہ مشہور ہیں) قیام پذیر ہوتے۔ دوسرے دن مکہ معظمہ گئے۔ وہاں پہلے کی طرح اب بھی مدرسہ صولتیہ میں ٹھہرے۔ پھر عمرہ کیا۔ دو دن کے بعد یعنی سہ شنبہ (۳۱ جنوری) کو پہلا روزہ رکھا۔ رات کو حرم شریف میں تراویح پڑھی۔ وہاں سے واپس مدرسہ صولتیہ آئے۔ احباب سے قریب ایک بجے رات تک (یعنی ہمارے یہاں کے تین بجے رات تک) باتیں کرتے رہے۔ پھر آرام کے لیے لیٹے تو اچانک ANGINA کا درد اٹھا۔ سینہ ملتے رہے۔ لیکن قریب ایک گھنٹہ کے بعد اللہ اللہ کرتے

کرتے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہاشمی صاحب سندیلہ کے رہنے والے تھے ① خاتون منزل لکھنؤ میں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے میٹرک وغیرہ پاس کیا۔ اور کچھ دن کے بعد ACCOUNTS DEPARTMENT میں ملازم ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد محکمے کی منتقلی سے کراچی آگئے تھے۔ اُن سے میری ملاقات سنہ ۱۹۵۰ء میں ہوئی جب کہ انھوں نے اردو کالج میں بی اے میں داخلہ لیا۔ ادب و احترام، شائستگی اور انکساری اُن کی امتیازی شان تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ کسی اعلیٰ خاندان سے وابستہ ہیں۔ طلبہ میں بھی وہ اپنے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے معزز و مکرم تھے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں بی اے اور سنہ ۱۹۵۴ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ دوسرے سال تاریخِ اسلام میں بھی ایم اے کیا۔ پہلے وہ محلہ رنچھوڑ لائن میں رہتے تھے، پھر لالو کھیت میں مکان لے لیا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے لالو کھیت سے کچھ سامان خریدا اور اپنے مکان (۲۲۸۔ پیر الٰہی بخش کالونی) آنے والا تھا کہ ہاشمی صاحب مل گئے۔ فرمانے لگے کہ میں بھی ایک ضروری کام سے آپ کے مکان کے قریب جانا چاہتا ہوں۔ ایسا کہ کر انھوں نے اصرار کے ساتھ میرا سامان لے لیا اور میرے مکان تک پہنچا دیا۔ بس یہی ضروری کام تھا۔

میں سنہ ۱۹۵۶ء تک اردو کالج میں رہا۔ وہاں اور اس سے پہلے اسلامیہ کالج میں بھی ایم اے کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ سنہ ۱۹۵۴ء کے بعد یونی ورسٹی نے ایم اے کلاسوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اردو کالج کے اساتذہ کے تعاون سے پڑھائی شروع کرادی۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں مجھے سندھ یونی ورسٹی والوں نے بلا لیا اور علامہ آئی آئی قاضی مرحوم نے اپنی خاص شفقت کی بنا پر میرے لیے مکان بھی تعمیر کرا دیا۔ جولائی میں مجھے حیدرآباد

---

① ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب نے "تذکرۂ مشاہیرِ سندیلہ" (مؤلفہ چودھری نبی احمد) سنہ ۱۹۷۶ء میں مرتب کر کے لکھنؤ سے شایع کیا تھا۔ اُس میں ہمارے ہاشمی صاحب کے حالات (صفحہ ۲۹۴۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷ وغیرہ) میں ہیں۔

منتقل ہونا پڑا اور اُسی زمانے میں ہاشمی صاحب کو ان کے محکمے نے لاہور بھیج دیا۔ وہاں وہ چند روز ہی رہے تھے کہ وہاں سے انھوں نے مجھے لکھا کہ آپ کے بغیر میرا دل یہاں نہیں لگتا۔ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ آپ یہاں آجائیں۔ وہ فوراً وہاں سے آگئے۔ اب میں فکر مند ہوا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے انھیں بُلا لیا ہے تو ان کے لیے کوئی انتظام تو ہونا چاہیے۔ اللہ کی شانِ کریمی کہ اُسی زمانے میں حیدر آباد میں سردار بہادر کالج قائم ہوا۔ میں نے اُن کے پرنسپل صاحب کو خط لکھا کہ ازراہِ کرم آپ ہاشمی صاحب کو لیکچرر کی جگہ عنایت فرمادیں۔ وہ اس قدر شریف النفس تھے کہ میرے خط پر ہاشمی صاحب کا تقرر کر دیا۔ وہ کچھ عرصے تک وہاں کام کرتے رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک بہتر صورت پیدا فرمادی۔ وہ یہ کہ خود سندھ یونی ورسٹی میں لیکچرر کی جگہ کا اعلان ہوا۔ میں علامہ قاضی صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھوں نے خوشی کے ساتھ ہاشمی صاحب کو لے لیا۔ پھر اُن کے قیام کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا فرمادیے۔ ہوا یہ کہ اسی زمانے میں حکومت نے لطیف آباد میں مکانات تعمیر کرائے۔ وہاں لطیف آباد نمبر دس میں (گو کہ دور ہے) مکان ملنے کا امکان تھا۔ میں نے ہاشمی صاحب سے کہا کہ آپ فوراً وہاں منتقل ہو جائیں۔ وہ کہنے لگے کہ وہ جگہ بہت دور ہے اور غیر آباد بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ایسا نہ سوچیں۔ وہ جلد آباد ہو جائے گی۔ چناں چہ بادلِ ناخواستہ وہ وہاں چلے گئے۔ پھر ان کے گھر والے بھی وہاں آگئے۔ سندھ یونی ورسٹی اُس زمانے میں حیدر آباد ہی میں تھی، (گو کہ اُس کے چند شعبے اب بھی حیدر آباد میں ہیں) ہاشمی صاحب لطیف آباد سے سائیکل پر، پھر اسکوٹر پر آنے لگے، اور بہت محنت سے کام کرنے لگے۔

علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ (م ۱۹۵۳ء) نے اپنی وفات کے بعد جواب میں مجھ سے فرمایا تھا کہ حیاتِ شبلی کا دوسرا حصّہ تم لکھ دو۔ میں نے یہ موقع غنیمت جان کر ہاشمی صاحب کو پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے پر آمادہ کیا اور "شبلی کا ذہنی ارتقا" موضوع تجویز کیا۔ انھوں نے اس موضوع پر بڑی محنت کی۔ لکھنؤ تو وہ جاتے ہی رہتے تھے۔ وہاں ندوہ کی لائبریری کھنگال ڈالی اور اعظم گڑھ میں جس قدر معلومات حاصل ہو سکتی تھیں بڑے سلیقے سے جمع کیں اور ایک ضخیم مقالہ تیار کیا۔ اُس زمانے میں یہاں یونی ورسٹی میں ایک ایسے صاحب آگئے تھے جو کئی لحاظ سے "کان کے کچے" تھے۔ ان لیے وہ مقالہ قریب ڈیڑھ سال تک یونی ورسٹی کے دفتر میں پڑا رہا۔ پھر بڑی مشکل سے وہ ممتحن حضرات کے پاس بھیجا گیا۔ بہرحال ہاشمی صاحب کو ڈگری مل گئی۔ لیکن افسوس کہ اس مقالے کی طباعت کا ابھی تک کوئی انتظام نہ ہو سکا۔

ہاشمی صاحب علمی کاموں میں برابر حصّہ لیتے رہتے تھے۔ خود بھی لکھتے رہتے تھے اور طلبہ کو بھی آمادہ کیا کرتے تھے۔ چناں چہ متعدد طلبہ نے اُن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی (سنہ ۱۸۹۷ء بہ سنہ ۱۹۶۸ء) کا دیوان لمعاتِ نشتر انھوں نے مرتب کر کے (مع مقدمہ) سنہ ۱۹۶۶ء میں شایع کیا تھا۔ ہاشمی صاحب کے بہنوئی شاہ راشد علی نے روح العبادات سنہ ۱۹۵۲ء میں لکھی تھی، ہاشمی صاحب نے سنہ ۱۹۶۹ء میں اسے شایع کیا۔ رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کا ایک انتخاب (حصّۂ اوّل صفحات ۳۴۴) بھی مع مقدمہ۔ صفحات ۶۴) طلبہ کے لیے سنہ ۱۹۷۰ء میں شایع کیا تھا۔ ایک مجموعۂ مضامین "ادبی آئینے" بھی جون سنہ ۱۹۷۴ء میں شایع کیا۔ اُردو لغت بورڈ کے لغات پر نظرِ ثانی کا کام آخر وقت تک کرتے رہے۔

دو طویل مضمون (۱) "مولانا شبلی کے خطوط مولانا سلیمان ندوی کے نام" اور (۲) "اقبال کا مردِ مومن" زیرِ طبع ہیں۔

اُنھیں ذاتی طور پر فرنگی محل، دریاباد، کاکوری، بجنور، اعظم گڑھ، الٰہ آباد وغیرہ کے علماء اور صلحاء سے وابستگی رہی تھی اور خود اُن کے آباؤ اجداد کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل تھیں، اس لیے میں بار بار اُن سب کو جمع کرنے کے لیے کہتا رہتا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ اپنی ذاتی مصروفیات اور بیماری ANGINA کی وجہ سے نہیں لکھ سکے۔

عام مشاعروں کی غیر سنجیدگی کی وجہ سے شعبۂ اردو نے "نعتیہ مشاعرہ"

کی ابتداء کی تھی۔ عموماً رمضان المبارک کے کسی دن ظہر سے مغرب تک یہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ پھر طلبہ میں علمی تحقیق کا ذوق پیدا کرنے کے لیے اور لکھنے کی عادت بنانے کے لیے شعبۂ اردو نے ایم اے (فائنل) کا ایک پرچہ "اصولِ تحقیق اور اصلاحِ املا" کے لیے مختص کیا تھا۔ دوسرے مقامات پر یہ دونوں چیزیں بعد میں اختیار کی گئی ہیں۔ ہاشمی صاحب کو ان دونوں کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔

دہلی کا سلیقہ اور لکھنؤ کی نفاست وہاں کے ادب اور معاشرے میں نمایاں ہے۔ ہاشمی صاحب اس نفاست کا پیکر تھے۔ اُن کی ہر بات اور ہر گفتگو اسی لطافت اور نفاست کی آئینہ دار تھی۔ ہنسی مذاق اور خوش کلامی ایسی تھی کہ محفل میں اُنھی کی شمع روشن رہتی تھی۔ پھر ہمارے محترم مولانا ڈاکٹر ابوالفتح صغیرالدین صاحب (سابق صدر شعبۂ اسلامیات، سندھ یونی ورسٹی) کی وجہ سے اس شمع کی روشنی اور بڑھ جاتی تھی۔ اللہ اللہ، کیا دن تھے اور کیسی باتیں تھیں! اب کیوں کر اُن کا اعادہ ہو سکتا ہے!

ہاشمی صاحب کو غیبت سے سخت نفرت تھی، بلکہ اگر انھیں کسی شخص سے تکلیف پہنچتی تھی تو اُس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیشہ "بر غیر بدبیں مباش" اُن کا شیوہ تھا۔

خاندان میں ہاشمی صاحب کا نام صابر تھا اور وہ واقعی صابر تھے۔ اُن کے دو بیٹے فوت ہوئے لیکن میں نے اُن کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا تو اس وقت بھی انھوں نے اظہارِ غم نہیں ہونے دیا۔ مظہر محمود شیرانی کے مقالے کے ممتحن تھے اور زبانی امتحان کے لیے انھیں لاہور جانا تھا۔ لیکن حیدر آباد سے وہاں کے لیے ہوائی جہاز نہ ہونے کی وجہ سے وہ بس سے کراچی جانے والے تھے۔ ٹھیک اُسی وقت لکھنؤ سے میرے پاس اطلاع آئی کہ ہاشمی صاحب کے چھوٹے بھائی مطیع احمد کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں دوڑتا ہوا اُن کو اطلاع پہنچانے کے لیے پہنچا تو اس وقت بھی انھوں نے غم کا اظہار نہیں کیا۔

ہاشمی صاحب پرانی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ کبھی اپنے بڑوں کے سامنے

اپنی اولاد کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اپنے بڑے بھائی سید علی احمد صاحب مرحوم کو کبھی اپنی اولاد کے متعلق کچھ کہنا مقصود ہوتا تھا، تو اپنی بھاوج صاحبہ کو لکھ دیتے تھے۔ خود میرے سامنے اپنی اولاد کے متعلق شاذ و نادر ہی کچھ کہتے تھے۔ انھیں مجھ حقیر سے بہت محبت تھی۔ ان کے سب بچے مجھے① "ڈاکٹر دادا" کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ محض عقیدت کی بنا پر ہاشمی صاحب نے میری پُرانی شیروانی مجھ سے لے لی اور درزی کو دو سو روپے دے کر اسے اپنے لیے صحیح کرائی۔ پارسال اسی عقیدت کی وجہ سے مجھ سے میری گرم صدری لے لی۔ وہ پارسال کی سردی میں اور ابھی اس سال کی سردی میں بھی بہت خوش ہو کر اُسے پہنے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اور ان کے بیٹے میرے پاؤں دابنے لگتے تھے۔ میں منع کرتا لیکن وہ نہیں مانتے۔ پھر میں کہتا کہ "کمزور کو سب دباتے ہیں"۔ اس جملے سے وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔

ہاشمی صاحب نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے۔ اور اس لحاظ سے وہ میرے پیر بھائی تھے۔ خاموشی سے ریاضت کرنے کے عادی تھے۔ تلاوت اور وظائف بھی تنہائی کے معمولات تھے۔ ابھی جب کہ وہ اپنے بڑے صاحبزادے زُبیر میاں کی وجہ سے اسٹیل مل کالونی (کراچی) میں رہنے لگے تھے تو میرے بار بار کہنے پر چند حضرات کے ساتھ مراقبہ کرنے لگے تھے ورنہ اس معاملے میں وہ تنہائی پسند تھے۔ کئی بار سرہند شریف حاضر ہوئے ہیں۔

میرا اندازہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے کم از کم ۴۲ سال تک رمضان المبارک کے اعتکاف میں ناغہ نہیں کیا۔ پارسال وہ رمضان المبارک سے حج تک حرمین شریفین ہی میں رہے۔ اس سال بھی اسی مقصد کے لیے مکۂ معظمہ گئے تھے۔ انھوں نے تین حج کیے تھے۔ پہلا ۱۹۶۷ء میں، پھر ۱۹۸۶ء میں (اپنی اہلیہ کے ساتھ) اور پارسال ۱۹۹۴ء میں مشرف ہوئے تھے۔ یہ تینوں حج بحری سفر سے کیے کہ بحری سفر کو وہ ترجیح دیتے تھے۔ اس

---

① اُن کے نو بچے ہیں۔ زبیر احمد، عمیر احمد، سہیل احمد، جنید احمد، صہیب احمد اور چار بیٹیاں۔

سال ہوائی جہاز سے گئے تھے۔

میں نے ہاشمی صاحب کے والد صاحب (حاجی حسین احمد عرف حاجی میاں) کے انتقال پر (۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء) اور والدہ صاحبہ کی وفات پر (۱۳۸۹ھ / ۱۹۷۰ء) تاریخی قطعے لکھے تھے۔ آج ہاشمی صاحب کی یاد کو اس طرح تازہ کرتا ہوں:۔

"سخی احمد اعلیٰ گہر ہاشمی" "بہشت آشیاں، جنتی جنتی"

۱۴۱۵ھ ۱۹۹۵ء

(شب چہارشنبہ۔ ۲ رمضان المبارک)

(یکم فروری)

کسی کا شعر ہے:۔

رات دن زیرِ زمیں لوگ چلے جاتے ہیں نہیں معلوم تہِ خاک تماشا کیا ہے!

مرحوم کا آخری خط میرے نام یہ تھا:۔

۱۴ شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ باسمہ حامداً و مصلیاً ۱۶ جنوری ۱۹۹۵ء

یوم دوشنبہ وقت ۱۱½ بجے دن

محترمی و معظمی ڈاکٹر صاحب مدظلہ۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ میں نے ٹکٹ لے لیا ہے آج ویزا آگیا ہوگا۔ کل انشاءاللہ لے آؤں گا۔ اب کی بھی عمرہ اور حج و زیارت کا ارادہ ہے اللہ تعالیٰ پورا فرمائے۔ لڑکے حیدرآباد جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں نہیں جاتے جو خیریت معلوم ہو۔ ردمی کے تو حیدرآباد کے کئی چکر لگتے ہیں۔ کل گیا ہے اور وہیں ہے۔ میں انشاءاللہ تعالیٰ جانے سے قبل ملنے حاضر ہوں گا۔ محفوظ صاحب وغیرہ کا بھی کچھ پروگرام بن رہا ہے۔ شاید اسی طرح آنا ہو میں ایک دو روز ٹھہر جاؤں گا۔ انشاءاللہ۔ شاید ابھی سنیچر کو آنا ہو۔ پروگرام بننے پر ہے۔ عزیزی حافظ منیر سلمہ کو سلام و دعا، پیر بھائیوں کو سلام۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ یہاں سب سلام کہتے ہیں۔

فقط والسلام۔ محتاجِ دعا۔ ہاشمی

بھائی احسان اللہ عباسی مرحوم

بھائی احسان اللہ کے خاندان سے میرے تعلقات ۷۰-۷۲ سال سے ہیں۔ اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق جونپور (یوپی) سے زیادہ رہا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب سی پی کے صوبے کی تشکیل ہوئی تو اس خاندان کے بزرگ جناب قادر بخش کو منصف مقرر کیا گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد حسین تحصیلدار ہوئے۔ وہ جبل پور کی انجمن اسلامیہ اور اُس کے اسکول کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں وہ اسکول قائم ہوا۔ اُن کے انتقال (۱۹۱۵ء) کے بعد اُن کے داماد محمد کاظم صاحب (م ۱۹۳۴ء) بعہدۂ ناظر تھے اور وہ بھی قومی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ محمد کاظم صاحب جناب امداد حسین بن امیر علی کے صاحبزادے تھے۔ امداد حسین کے دوسرے صاحبزادے حافظ محمد رضا تھے جن کے صاحبزادے مولانا محمد شبلی (م ۱۹۶۷ء) جبل پور مسلم لیگ کے مشہور کارکن تھے۔ حافظ محمد رضا کے ایک بھائی حافظ محمد جعفر تھے جن کے صاحبزادے حاجی حافظ معین الدین بڑے عابد و زاہد تھے۔ کراچی میں ۱۹۷۱ء میں انتقال کیا۔ ①

محمد کاظم صاحب کے پوتے محبوب عالم (ولد محمد ہاشم) جبل پور کے انجمن اسکول کی مڈل کلاسوں میں میرے ہم جماعت تھے۔ اُن کے سب اعزاء محلّہ ادمتی میں رہتے تھے لیکن اُن کا مکان مقدم گنج کے شمالی حصے میں تھا۔ میں اکثر اُن کے یہاں جاتا رہتا تھا۔ میرے ایک ہم جماعت سید محمد سعید اور دوسرے نعیم اللہ خاں بھی ساتھ ہوتے تھے۔ ②

---

① مولانا محمد شبلی کے صاحبزادے محمد مدنی عباسی نے "تذکرۂ عباسیانِ جونپور" (کراچی ۱۹۷۴ء) بڑی محنت سے شایع کیا تھا۔ اسی میں سے یہ حالات عرض کیے گئے ہیں۔

② نعیم اللہ خاں کے والد رحیم اللہ خاں صاحب ساتویں جماعت میں جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ اپنے خرچ سے اس کے NOTES لکھوا کر طلبہ میں تقسیم کرتے تھے اور اس قدر محنت سے یاد کراتے تھے کہ تمام دنیا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اُن کے مکان کے صحن کی ایک چپاتی اب تک یاد ہے کہ وہ ۲۰-۲۵ سال میں خاصی بڑی ہوگئی تھی۔
محبوب عالم اپنے خاندان والوں کی طرح غیر معمولی ذہین تھے۔ کلاس میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے لیکن بیماریوں نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ تاہم وہ سی پی کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے بی اے کے امتحان میں انگریزی میں اول آنے پر طلائی تمغا حاصل کیا تھا۔

حضرت حاجی حافظ معین الدین (م ۱۹۷۱ء) جن کا ذکر اوپر آیا ہے بڑے کنبہ پرور تھے۔ سب کا خیال رکھتے تھے۔ اُنھی کے صاحبزادے احسان اللہ عباسی تھے انھوں نے ۱۹۳۱ء میں درجہ اول میں میٹرک پاس کیا اور حساب میں خان بہادر ایچ ایم ملک گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اُنھوں نے سائنس میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ پھر علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس سلسلے میں ان کے والد صاحب کو حضرت مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب ناظم دینیات، مسلم یونی ورسٹی (م ۱۹۴۰ء) نے تین مکتوبات بھیجے تھے (جو تبرکات میں سے ہیں اور اُن کا عکس آخر میں دیا جائے گا)۔ ان مکتوبات سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے مکتوب (۱۹۳۲ء) میں مولانا نے احسان اللہ صاحب کے والد صاحب کو "عزیز من سلمہ" کہہ کر خطاب کیا ہے۔ یعنی وہ مولانا سے بہت چھوٹے تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ علی گڑھ کا انٹر کالج توڑ دیا گیا اور اس کے دو درجے (نویں اور دسویں جماعتیں) اسکول میں شامل ہوگئے ہیں۔ یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ احسان اللہ کو انٹر پاس کرانے کے بعد علی گڑھ بھیجا جائے۔ اسی مکتوب کے آخر میں کہ "اپنے والد اور تمام اعزّہ کو میرا اسلام کہیے"۔ یعنی احسان اللہ صاحب کے دادا (حافظ محمد جعفر) ۱۹۳۲ء تک ضرور زندہ تھے۔ دوسرے مکتوب (۱۹۳۳ء) میں احسان اللہ صاحب کے والد صاحب کو "برادرم" کہا ہے۔ تیسرے مکتوب میں بھی (جو اسی سال کا ہے) اُن کو "برادر عزیز" کہا ہے (۱) اور لکھا ہے کہ "آپ کی ایک درخواست علی گڑھ

(بقیہ گذشتہ سے پیوستہ) کے ملکوں کے بڑے بڑے شہروں کے نام اور وہاں کی آب و ہوا وغیرہ کا حال مجھے تو اب تک اُن کی وجہ سے یاد ہے۔

(۱) احسان اللہ صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ میں بہت چھوٹا تھا تو والد صاحب کے ساتھ جونپور گیا تھا۔ وہاں مولانا ابوبکر، حضرت مولانا سخاوت علی عُمری (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے پروفیسر حبیب صاحب نے (جو آفتاب ہال کے پرووسٹ PROVOST بھی تھے) میرے پاس ــــــ (یعنی جونپور) بھیجی ہے تاکہ اُسے میں آپ کے پاس بھیج دوں۔ اس لیے اس کو بھیجتا ہوں ــــ اس سے معلوم ہوا کہ اُس کو ۱۵ ستمبر تک پہنچ جانا چاہیے۔ اُس وقت تک تو میں علی گڑھ نہ جا سکوں گا اور جونپور ہی میں رہوں گا۔ لیکن عزیزم حافظ محمد ایوب سلمہ وہاں ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ان سے سب باتیں کہہ چکا ہوں ــــ گو آپ نے بہت دنوں سے ایوب کو نہیں دیکھا ہے۔ مگر یاد تو ہوں گے۔ آجکل وہ بھی آئے ہوئے ہیں۔ پھر ۱۵ تک میں پہنچ جاؤں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ایوب صاحب حافظ تھے (یہ بات راقم الحروف کو اس مکتوب سے معلوم ہوئی) اور مولوی فاروقی کا ذکر ہے جو مولانا ابوبکر کے صاحبزادے (۲) تھے اور علی گڑھ میں دینیات کے استاد تھے اور والدہ صاحبہ کا ذکر بھی ہے یعنی خود مولانا کی والدہ صاحبہ بھی اُس وقت تک (یعنی ۳- اگست ۱۹۳۳ء تک) زندہ تھیں۔

علی گڑھ کا انٹرمیڈیٹ کالج (مولانا کے پہلے مکتوب کے مطابق) ۱۹۳۱ء میں قانوناً توڑ دیا گیا ہوگا لیکن عملاً اُس وقت تک توڑا نہیں گیا تھا۔ کیوں کہ دسویں کے ایک طالب علم ممتاز علی (جو میرے ہم وطن اور مخلص دوست تھے) ۱۹۳۳ء میں میرے قریب ہی کے کمرے میں (ماریسن کورٹ میں) رہتے تھے۔

ہوا یہ تھا کہ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں آفتاب ہال قائم ہوا۔ اُس میں آفتاب ہوسٹل اور ماریسن کورٹ صرف دو ہوسٹل شامل تھے۔ اُس کے پرووسٹ پروفیسر محمد حبیب صاحب (پروفیسر تاریخ) تھے۔ انھوں نے ذہین طلبہ کو ان دونوں ہوسٹلوں میں (دوسرے ہوسٹلوں کے مقابلے میں کچھ کم اخراجات پر) داخلہ دیا۔

احسان اللہ عباسی صاحب نے جبل پور میں مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے کہا کہ آپ ضرور درخواست

(بقیہ حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) (یعنی فاروقی م ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء) کے پوتے اور مولوی حافظ ابوالخیر مکی رحمہ کے بیٹے تھے۔ دیکھیں تذکرۂ علمائے ہند از مولانا رحمٰن علی۔ صفحہ ۲۰۷-۲۰۸-۲۷۲)

دیدیں۔ پھر میں نے بھی درخواست دے دی۔ ممتاز علی جن کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے وہ بھی ساتھ ہوگئے اور قریب کے کمروں میں (مارلیس کورٹ میں) رہنے لگے۔ غالباً اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ممتاز علی کے والد جناب تحصیلدار ماجد علی صاحب کا جبل پور میں انتقال ہوگیا تو وہ کچھ دنوں کیلیے جبل پور چلے گئے۔ اسی زمانے میں بھائی احسان اللہ کو سخت خارش ہوگئی یہاں تک کہ وہ کھانا بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں کھا سکتے تھے اور اپنے کپڑے بھی بدل نہیں سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی اور میں ان کی خدمت کرتا رہا۔ بحمداللہ ۱۵ - ۲۰ دن بعد وہ صحت یاب ہوگئے۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد انھوں نے بتایا کہ مجھے ملازمت مل گئی ہے اس لیے میں اب علی گڑھ چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن انھیں علی گڑھ چھوڑنے کا ہمیشہ ملال رہا۔ چنانچہ وہ جبل پور چلے گئے۔ ان کے چھوٹے بھائی انعام اللہ عباسی صاحب نے مرحوم کی ملازمت کی تفصیل ۸ مئی ۱۹۹۵ء کے خط میں مجھے اسطرح لکھی ہے:۔

ان کی سروس بک نہیں مل سکی۔ مگر فائل سے کچھ ایسے کاغذات ملے جن سے تاریخ ریٹائرمنٹ ۱۷ جولائی ۱۹۷۲ء اور عہدہ A.A.O ثابت ہوا یہ عہدہ مخفف ہے برائے Assistant Audit and یا Assistant Account Officer یا Accounts Officer۔ چونکہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۱ء تک واپڈا میں ڈیپوٹیشن پر رہے مگر اسی دوران Directorate General Post and Telegraph ان کا Parent Office رہا اور اس سے پہلے ان کی کمرشیل آڈٹ میں بھی ڈیپوٹیشن پوسٹنگ ہوئی تھی چنانچہ آڈٹ کیلیے مختلف مقامات (پشاور وغیرہ) جاتے رہتے تھے۔ کچھ کاغذات سے معلوم ہوا کہ Pension Papers Orders وغیرہ D.G.P&T. کے دفتر سے بھی جاری ہوتے تھے۔

مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں (ہندوستان میں) زیادہ تر ناگپور اور سیونی میں رہے۔ پھر لاہور۔ حیدرآباد وغیرہ میں بھی عرصے تک رہے۔ اور اکثر دیشتر وہ تشریف لاتے تھے۔ میں بھی بارہا ناگپور میں ان کے یہاں ٹھہرا ہوں۔ خوش کلام

خوش پوش اور نہایت مخلص تھے۔ کراچی سے بھی ابھی ۵ - ۶ ماہ قبل بھی وہ میرے پاس تشریف لائے تھے۔ میلوں تک ٹہلنے کا شوق تھا۔ آخر وقت تک وہ بحمداللہ صحت مند تھے لیکن ایک رکشے کی ٹکر سے اُن کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ہسپتال سے بھی انھوں نے مجھے اپنے زخموں کا حال لکھوایا تھا۔ کچھ طبیعت سنبھلنے لگی تھی تو گھر آ گئے تھے۔ لیکن اللہ کی مرضی کہ وہ جاں بر نہ ہو سکے اور یک شنبہ ۳۰ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ ۳۰ اپریل ۱۹۹۵ء کو ہم سب سے رخصت ہوگئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

بھائی ابراہیم علی خان مرحوم

آپ کے آباد اجداد کا تعلق رام پور سے تھا۔ نانا محمد خان صاحب وہاں کے آکر صوبہ سی پی میں اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔ آخری عمر میں ہوشنگ آباد (سی۔پی) میں قیام رہا اور وہیں انتقال فرمایا۔

والد نواب غلام محی الدین علی خان کی بڑی جائیداد بھنڈارا میں تھی۔ وہاں جائیداد کی نگہداشت کے لیے گئے ہوئے تھے تو چند ہندوؤں نے قصبہ لاکھنی میں ۱۹۲۰ء میں اُن کو شہید کر دیا۔ اُن کی اولاد میں پانچ صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے تھے۔ نواب صدیق علی خان (۱۹۰۲ء تا ۱۹۷۴ء) گو کہ تین بہنوں سے چھوٹے تھے لیکن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اس لیے گھر کی ہر طرح کی ذمہ داری اُن پر عائد ہوئی۔ اُن سے چھوٹے نواب تقی علی خان (م ۱۹۶۰ء) تھے۔ اُن سے چھوٹے نواب ابراہیم علی خان (میرے خاص کرم فرما) تھے۔ اور اُن سے چھوٹے نواب ہدایت علی خان صاحب ہیں۔ حیدر آباد (سندھ) میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو سلامت باکرامت رکھے۔ آمین۔

نواب صدیق علی خان کی ذاتِ گرامی ہندوستان اور پاکستان میں محتاجِ تعارف نہیں۔ شہیدِ ملت نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم (م ۱۹۵۱ء) کے آخری دم تک دستِ راست رہے۔ اس سے پہلے وہ مسلم نیشنل گارڈ کے صدر تھے۔ صوبہ سی پی کے کرکٹ ایسوسی ایشن کے مدتوں سیکریٹری رہے۔ انجمن اسلامیہ ہائی اسکول ناگ پور کی سلور جوبلی کا آپ ہی کی وجہ سے گورنر سر ہائیڈ گون نے افتتاح کیا۔ ۱۹۳۴ء میں پورے صوبے سے ایک واحد نمائندہ کے لیے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں مسلم کرکٹ ٹیم کی قیادت کی۔ ۱۵ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پھر افریقہ کی سفارتی ذمہ داری سپرد ہوئی تو جولائی ۱۹۶۱ء میں فراغت پائی۔ اسی زمانے میں حج بھی ادا کیا۔ اور آخری وقت کراچی میں گزارا۔ ایسے خوش شکل، خوش پوش، صحت مند اور سراپا اخلاص حضرات بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ممتاز تھے بلکہ قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کے ممتاز مخلصین میں سے بھی تھے۔

نواب ابراہیم علی خان دوشنبہ ۴ جولائی ۱۹۱۰ء (۲۵ جمادی الآخر ۱۳۲۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ناگ پور میں ہوئی۔ پھر اپنے خالہ زاد بھائی مونس حسین کے ساتھ علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں ۱۹۲۷ء میں میٹرک اور ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ مجبوریوں کی وجہ سے وقفے وقفے سے تعلیم ہوئی۔ یعنی ۱۹۳۳ء میں وہیں سے بی اے اور ۱۹۳۶ء میں بی ٹی پاس کیا۔ تعلیم کا شوق بہت تھا۔ اس لیے ۵۱ سال کی عمر میں، کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے (جنرل ہسٹری) بھی پاس کیا۔

آپ کی شادی جاورہ کے نواب نیاز احمد خان کی صاحبزادی سعیدہ بیگم سے ۲۶ جون ۱۹۳۸ء کو ہوئی۔ وہ نواب صدیق علی خان کی پہلی بیگم کے خالہ زاد بھائی تھے۔

نواب ابراہیم علی خان مرحوم کی دو صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے ہیں۔ بڑی صاحبزادی رفعت جہاں ہیں۔ اُن کی شادی سید عبداللطیف شاہد سے ہوئی جو نواب غلام محی الدین خان (یعنی ابراہیم علی خان کے والد صاحب) کے نواسے ہیں۔ رفعت جہاں کے صاحبزادے سید عدنان احمد اور صاحبزادی ناعمہ بلقیس ہیں۔

دوسری صاحبزادی عفت بانو ہیں۔ اُن کی شادی حضرت امیر مینائی کی پوتی کے بیٹے مظفر احسن عثمانی سے ہوئی۔ وہ لاہور میں ہیں۔ اُن کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔

بھائی ابراہیم علی خان کے ایک ہی صاحبزادے شعیب علی خان ہیں جو انجینئر ہیں اور PAR CO میں کام کرتے ہیں۔ اُن کی شادی اُن کے چھوٹے چچا ہدایت علی خان صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔

رفعت بانو صاحبہ کی صاحبزادی ناعمہ بلقیس نے بھائی ابراہیم علی خان کے انتقال سے قریب ڈھائی ہفتے پہلے اپنے خواب میں اس راقم الحروف کو دیکھا تھا کہ اُن کے متعلق کہہ رہا تھا کہ "اب اُن کا وقت آگیا ہے"۔

عفت بانو صاحبہ نے ۱۲ر جون ۱۹۹۵ء کو مجھے تحریر فرمایا ہے کہ "میں لاہور میں رہتی ہوں۔ عید کے موقع پر ابّو سے ملنے آئی تھی۔ ابّو کمزور تو بہت تھے اور اُس زمانے میں فلو بھی ہو گیا تھا۔ جمعہ ۱۲ر مئی کو اُن کی طبیعت زیادہ خراب رہی لیکن تھوڑی دیر تک اسی حالت میں انھوں نے اپنے بچوں سے صلۂ رحمی، نماز، صدقہ، خیرات کے لیے نصیحت فرمائی۔ اُن کی کیفیت دیکھ کر میں رونے لگی تو انھوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کا واقعہ سُنایا اور صبر کی تلقین کی۔ دوسرے دن صبح کے وقت میں اپنے بھائی شعیب کے ساتھ ابّو کو عباسی شہید ہسپتال لے گئی۔ تاکہ ایکسرے اور دوسرے TESTS ہو جائیں۔ (وہاں ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ داخل کر دیا جائے۔ پھر آکسیجن لگا دی گئی اور کافی بہتر لگنے لگے۔ لیکن شام کو ۸ بجے سے بڑی بے چینی ظاہر ہونے لگی اور غالباً اُن کو اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وقت آگیا ہے۔ وہ اپنی ذاتی طہارت اور نماز کا خاص خیال رکھتے تھے اس لیے صاحبزادے سے اصرار کیا کہ اُن کو ہسپتال سے گھر منتقل کر دیا جائے۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا اور وہ آسانی کے ساتھ ہم سب سے جُدا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ۱۴ر مئی کو صبح ۱۱ بجے سخی حسن قبرستان میں تدفین ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے یکم جنوری ۱۹۸۸ء کو ایک وصیت نامہ اپنے عزیزوں کے لیے لکھا تھا۔ اُس کا ایک حصّہ یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہو گا۔ اس سے اُن کی خدا ترسی اور حقوق شناسی کا اندازہ ہو گا:-

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ تمام تعریف اُس خالقِ حقیقی کے لیے ہے جس نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور اُس کو عزت دینے کے فرشتوں سے سجدہ کرایا اور تمام مخلوقات پر فضیلت دی۔ اُس کی ہدایت کے لیے ایک عظیم اور مقدس صحیفہ قرآن کریم اپنے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے بھیجا تاکہ انسان دنیا میں اپنی زندگی اس کی ہدایت کے مطابق گزارے۔ اس کے احسانات اور کرم کا تقاضا ہے کہ ہم ہمہ وقت اُس کا شکر ادا کریں۔ اور اُس کے اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق اپنی زندگی گزاریں تاکہ رضائے الٰہی کے مستحق ہوں۔

ہزاروں درود و سلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جنھوں نے دنیا میں ہر قسم کی مصیبت برداشت کر کے احکامِ الٰہی ہم تک پہنچائے۔

میں مسمّی ابراہیم علی خان ولد غلام محی الدین علی خان مرحوم اپنے مکمل ہوش و حواس میں یہ وصیت نامہ مورخہ یکم جنوری ۱۹۸۸ء تحریر کر رہا ہوں تاکہ میرے وارثین اس پر عمل کریں اور حق داروں کو اُن کا حق پہنچا دیں۔

میں اس وصیت نامے میں اپنے جن عزیزوں سے مخاطب ہوں اُن کے نام حسبِ ذیل ہیں:-

زوجہ سعیدہ بیگم، بڑی بیٹی رفعت جہاں، چھوٹی بیٹی عفت بانو، بیٹا شعیب علی خان، بھلجے اور داماد۔ سید عبداللطیف شاہد (شوہر رفعت جہاں) داماد مظفر احسن عثمانی (شوہر عفت بانو)۔ آپ سب ہمہ وقت خداوند کریم کا شکر ادا کریں کہ اُس نے آپ سب پر فضل کیا اور اپنی نعمتوں سے نوازا، اس کے تمام احکامات کی پابندی کرتے رہیں اور اُس کے برگزیدہ رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتے رہیں۔ آپس میں اتحاد و اتفاق سے زندگی گزاریں تاکہ دین و دنیا کی فلاح کے مستحق ہوں۔ . . . .

بھائی ابراہیم علی خان پر اللہ تعالیٰ کی لاکھوں رحمتیں نازل ہوتی رہیں۔ اس عاجز پر علی گڑھ میں بھی بڑی شفقت فرماتے تھے۔ پھر کراچی اور حیدرآباد میں بھی

غریب خانے کو عزت بخشتے رہتے تھے۔ نہایت سنجیدہ اور خوش اخلاق تھے کم سخن تھے لیکن بات کرتے تو گویا منہ سے پھول برساتے تھے۔ مرنج و مرجاں تھے اور کسی کا دکھ درد دیکھتے تو ضرور اس کی امداد فرماتے تھے ؎

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات